

WWW.PAKSOCIETY.COM

تعلیم و تربیت

مارچ 2014



www.paksociety.com





پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا  
بچوں کا محبوب رسالہ

# تعلیم و تربیت

مارچ 2014ء

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

73 واں سال گیارہواں شمارہ

اس شمارے میں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

ہم انتہائی افسوس کے ساتھ آپ کو اطلاع دے رہے ہیں کہ فیروز سنز کے چیئرمین اور ماہنامہ تعلیم و تربیت کے چیف ایڈیٹر جناب عبدالسلام صاحب 2 فروری 2014ء کو قضائے الہی سے وفات پا کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں۔ انّ للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ خبر اس سے پہلے اخبارات اور ٹی وی چینلز کے ذریعے بھی لوگوں تک پہنچ چکی ہے۔ جناب عبدالسلام صاحب اس قدیم اشاعتی ادارے کے بانی مولوی فیروز الدین کی دوسری پشت میں سے تھے۔ اپنے والد جناب عبدالحمید کی 1980ء میں وفات کے بعد انہوں نے ادارے کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں سنبھالی اور ایک طویل عرصے تک انتہائی جاں فشانی سے اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ وہ کچھ عرصہ سے عارضہ قلب میں مبتلا رہے جس کے دوران اس ممتاز ادارے کو چلانے کا کام ان کے فرزند جناب ظہیر سلام صاحب نے سنبھالا۔ جناب عبدالسلام صاحب ایک طویل عرصے تک حکومتِ اسپین کے اعزازی قونصلیٹ جنرل لاہور بھی تعینات رہے۔ علمی، ادبی، ثقافتی و سماجی حلقوں میں انہیں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

جناب عبدالسلام صاحب ملک کے اس ممتاز اور قدیم ادارے جس کی بنیاد درویش صفت بزرگ مولوی فیروز الدین نے رکھی تھی، اس کی محبت، خلوص اور لگن سے آب یاری کرتے ہوئے اس جہان فانی سے کوچ کر گئے ہیں۔ جب تک یہ ادارہ زندہ رہے گا، عبدالسلام صاحب کا نام بھی زندہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کے درجات بلند کرے، لواحقین کو صبر جمیل اور اس ناقابلِ تلافی نقصان کو برداشت کرنے کی ہمت دے۔ اللہ تعالیٰ جناب عبدالسلام صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ہم سب کو ان ہی کی طرح محنت، لگن اور ہمت سے کام کرنے کی توفیق دے۔ آمین!

جن احباب نے جناب عبدالسلام کی رحلت پر رابطہ کر کے افسوس کا اظہار کیا ہے، ادارے کے منتظمین ان کے شکر گزار ہیں۔ اس شمارے میں ہم بچوں کے لیے نیا سلسلہ وار ناول ”دولت پور میں“ قسط وار شروع کر رہے ہیں، اس سلسلے کی پہلی قسط ننھی فریدہ شامل اشاعت ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ سلسلہ بھی آپ کو بہت پسند آئے گا۔ آپ کے سالانہ امتحان بہت قریب ہیں، اپنی تمام تر توجہ امتحان کی تیاری پر مرکوز کریں۔ ہم آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔ آپ خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔ فی امان اللہ!

(ایڈیٹر)

|    |                    |                         |
|----|--------------------|-------------------------|
| 1  | مدیر               | اداریہ                  |
| 2  | کرامت بخاری        | حمد و نعت               |
| 3  | محمد طیب الیاس     | درس قرآن و حدیث         |
| 4  | تصور عباس          | کون پہلے                |
| 8  | فرزانہ چیمہ        | روشنی                   |
| 10 | ادارہ              | آئیے عہد کریں           |
| 11 | راشد علی نواب شاہی | پیارے اللہ کے.....      |
| 13 | امینہ بتول         | تنتلیاں                 |
| 17 | ادارہ              | سوال یہ ہے کہ           |
| 18 | ادارہ              | اوجھل خاکے              |
| 19 | خلیل جبار          | بہر و بیا               |
| 23 | ادارہ              | معلومات عامہ            |
| 24 | نخے باذوق قارئین   | آئیے مسکرائیے           |
| 25 | پر عزم قارئین      | میری زندگی کے مقاصد     |
| 26 | نخے قارئین         | بوجھ تو جانیں           |
| 27 | ادارہ              | کھیل دس منٹ کا          |
| 28 | زبیدہ سلطانہ       | محاورہ کہانی            |
| 29 | ڈاکٹر طارق ریاض    | بچوں کا انسائیکلو پیڈیا |
| 31 | ادارہ              | دامغ لڑاؤ               |
| 32 |                    | ذائقہ کارنر             |
| 33 | وقار محسن          | امن کا گیت              |
| 36 | عزیز اثری          | دولت پور میں.....       |
| 43 | غلام حسین مبین     | سنہرے لوگ               |
| 45 | ابو حمزہ قادری     | جب قرار داد.....        |
| 48 | نخے کھوجی          | کھوج لگائیے             |
| 49 | نخے قارئین         | مختصر مختصر             |
| 51 | رفیع یوسفی حرم     | عبداللہ کی ضد           |
| 52 | نخے ادیب           | آپ بھی لکھیے            |
| 55 | نخے قارئین         | ایڈیٹر کی ڈاک           |
| 57 | رانا محمد شاہد     | ڈانوسار                 |
| 59 | نسرین شاہین        | جوڈو کی تاریخ           |
| 61 | احمد عدنان طارق    | ہزاروں خواہشیں ایسی     |
| 64 | ادارہ              | بلا عنوان               |

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے  
سردق: قرار داد پاکستان

سرکولیشن اسٹنٹ

مشیر

اسٹنٹ ایڈیٹر

ایڈیٹر، پبلشر

چیف ایڈیٹر

محمد بشیر راہی

سعید لخت

عابدہ اصغر

ظہیر سلام

عبدالسلام

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔

UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816

E-mail: tot.tarbiatfs@gmail.com

tot tarbiatfs@live.com

پرنٹر: ظہیر سلام

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔

سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت

میں سرکولیشن مینجر: ماہنامہ ”تعلیم و تربیت“ 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔

فون: 36361310-36361309 فیکس: 36278816

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 500 روپے۔

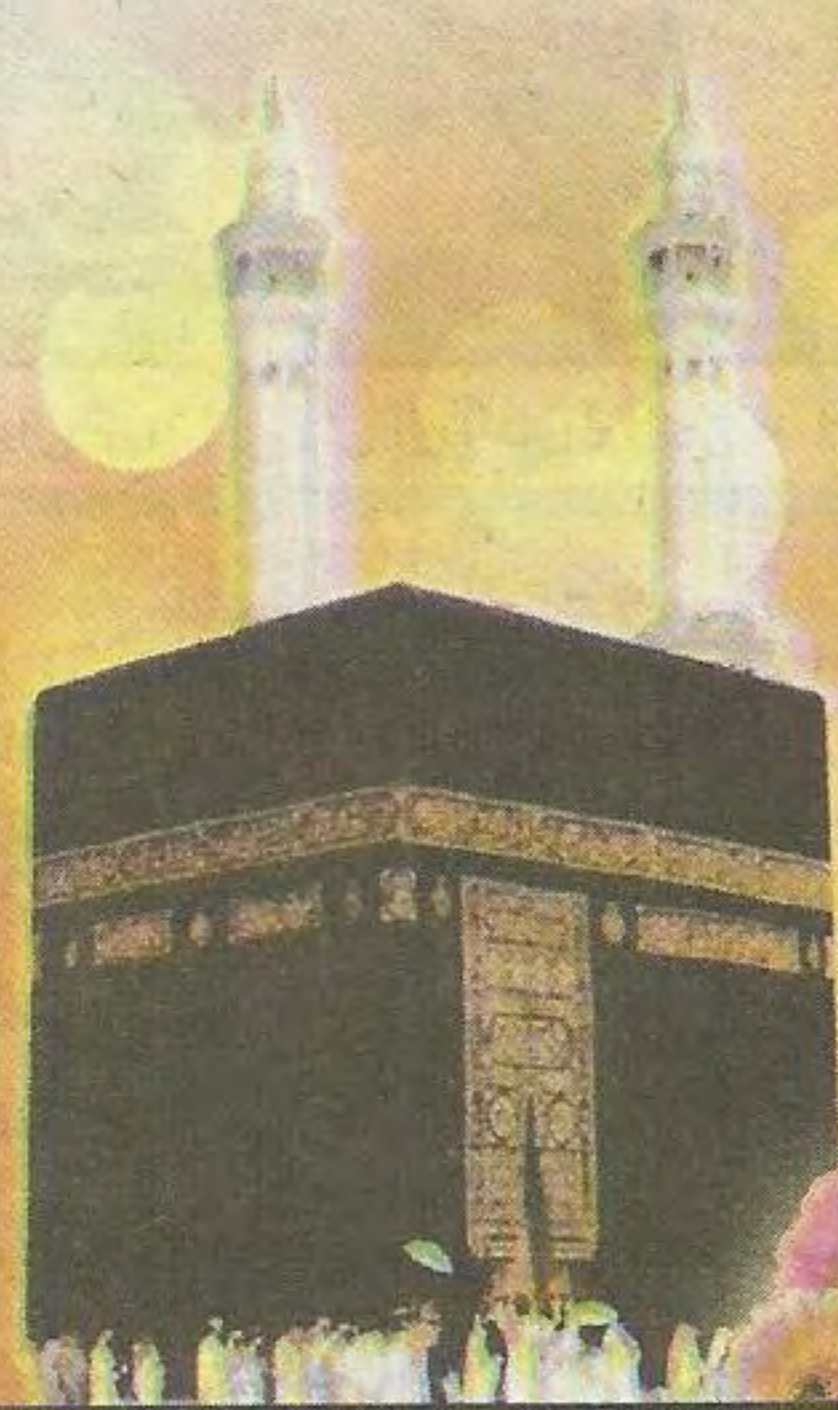
ایشیاء، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 2000 روپے۔

مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 2000 روپے۔

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 2000 روپے۔

قیمت فی پرچہ:  
25 روپے





### نعت رسول مقبولؐ

تصور میں خدائی ان سے آئی  
انہیں سے یہ بصیرت ہم نے پائی  
محمدؐ کی غلامی کی بدولت  
بتوں سے دل نے پائی ہے رہائی  
خدائے لم یزل ہے ذات یکتا  
گواہی پتھروں سے بھی دلائی  
زمانے کی ضرورت ان کی ہستی  
زمانے کی بھلائی مصطفائیؐ  
مجھے بھی ہو عطا حرفِ حقیقت  
ملے مجھ کو بھی اذن لب کشائی  
لکھوں نعتِ نبیؐ میں بھی ہمیشہ  
بنا کر آنسوؤں کی روشنائی

### حمد باری تعالیٰ

ہر اک لفظ میں بات اسی کی  
ہر اک حرف میں ذات اسی کی  
سورج چاند، ستارے اس کے  
دن بھی اس کا رات اسی کی  
پھل بھی اس کے پھول بھی اس کے  
سبزہ بھی سوغات اسی کی  
نیلے پیلے پھول اور پتے  
رنگوں کی بارات اسی کی  
پر بت جھرنے ندی نالے  
پانی بھی خیرات اسی کی  
پیتل چاندی لوہا تانبا  
سونے جیسی دھات اسی کی  
گن سکتا ہے کون کرامت  
کتنی ہیں برکات اسی کی

کرامت بخاری



محمد طیب الیاس

درس قرآن وحدیث

# نیکی ایک انمول اثاثہ

اپنی روشنی سے جگمگا دیتی ہے اور اس کی تنگی کو کشادگی میں بدل دیتی ہے اور انسان قبر میں پرسکون ہو جاتا ہے۔ پھر جب انسان قبر سے اٹھتا ہے، حشر کے میدان میں جاتا ہے اور حساب و کتاب ہوتا ہے تو وہاں نیکیوں کا وجود چمکتا دمکتا نظر آتا ہے۔

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کہ:

”جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔“

(سورۃ الزلزال: 7)

اور اس محشر کے میدان میں لوگ نیکیوں کے لیے ترستے ہوں گے۔ وہاں ایک ایک نیکی کی قدر ہوگی، اور درست نیت سے کی گئی نیکی اپنا بدلہ ضرور پائے گی۔ لہذا نیکی کرنے والا اپنی نیکی سے ضرور فائدہ حاصل کرے گا اور نیکیوں کا یہ اثاثہ ہمارے ہی کام آئے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ”جو کوئی نیک عمل کرے گا تو وہ اپنے لیے کرے گا۔“ (سورۃ الجاثیہ: 15)

حاصل کلام یہ ہے کہ ”نیکی ہمارا ایک انمول اثاثہ“ ہے۔ اس اثاثہ کی ہمیں حفاظت کرنی چاہیے۔ یہ اثاثہ ضائع ہوتا ہے جب ہم اللہ کے احکام کی نافرمانی کرتے ہیں۔

اس لیے پیارے بچو!

نیکی کے اس انمول اثاثہ میں خوب اضافہ کریں۔ گناہوں کے ذریعہ سے اس اثاثہ کو چوری مت کروائیں۔ اس اثاثہ کی خوب حفاظت کریں۔ چاہے نیکی چھوٹی سے چھوٹی ہو اس کو ہرگز حقیر اور کمزور مت جانے۔ کبھی چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی نجات کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ: نیکی میں سے کسی کو حقیر نہ سمجھو اگرچہ تم اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملو۔

(مسلم 2626)

پیارے بچو! آپ کا کوئی دوست آپ کو تحفہ (گفٹ) دے یا آپ کے امی ابو آپ کو کوئی خوب صورت سی چیز لے کر دیں تو آپ دوست کے دیئے گئے تحفے اور امی ابو کی دی گئی چیز کو دل و جان سے عزیز رکھتے ہیں اور اس کی حفاظت کا پورا اہتمام کرتے ہیں۔ خدا نخواستہ اگر وہ تحفہ یا چیز کھو جائے تو دل بے چین ہو جاتا ہے اور جب تک وہ چیز مل نہ جائے طبیعت بے قراری رہتی ہے۔ اگر وہ چیز بالکل ٹوٹ ہی جائے یا ضائع ہو جائے تو دل خون کے آنسو روتا ہے اور طبیعت بوجھل ہو جاتی ہے۔

جب ہم اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کرتے ہیں جو کہ ہمارے خالق و مالک ہیں تو ایک نیکی وجود میں آتی ہے۔ ایک چھوٹا سا بیج بڑھتا بڑھتا تندرست اور توانا شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور نفع پہنچانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ ایک ننھے سے بیج سے ظاہر ہونے والا پودا یا درخت ڈھیروں پھلوں کی صورت میں نفع دیتا ہے تو اسی طرح ایک نیکی اپنے ساتھ بہت سی نیکیوں کو لانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت یوں ہوتی ہے کہ ”ایک کی جانے والی نیکی پر دس گنا اجر ملتا ہے۔“ (الانعام: 160)

اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر بے حد مہربان ہیں۔ نیکی جو کی وہ تو ایک ہے مگر اس کا اجر و ثواب جو نامہ اعمال میں درج ہوتا ہے وہ دس گنا ہے۔ اگر ایک روپیہ خرچ کرنے پر دس روپے ملیں تو کوئی بھی سمجھ بوجھ رکھنے والا اس موقع کو ضائع نہیں کرتا۔ تو اسی طرح جب ہمیں بھی نیکی کا موقع ملے تو اس کو گنونا نہیں چاہیے کیا خبر کہ پھر موقع ملے یا نہیں؟ پھر دنیا کی ہر چیز فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے لیکن نیکی زندہ و تابندہ رہتی ہے۔ احادیث مبارکہ کے مطابق مال و اولاد صرف قبر تک ساتھ جاتے ہیں اور پھر واپس آجاتے ہیں لیکن نیکی قبر میں ساتھ جاتی ہے اور فائدہ بھی پہنچاتی ہے اور قبر کے تاریک گڑھے کو



تصور عباس



# کون پہلے

انسپکٹر عابد اور اس کی بیوی اس کا بھی اپنی بیٹی کی طرح خیال رکھتے تھے۔ وہ دونوں سارا دن ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتی رہتی جیسے وہ سگی بہنیں ہوں۔ امبر کے ابو انسپکٹر عابد، امبر کے لیے طرح طرح کے کھلونے لے کر آتے جن سے وہ اکٹھی کھیلتیں۔ شبانہ پہلے پہل تو اس بنگلہ کو اپنی ملکیت سمجھتی رہی کیوں کہ اس نے تو آنکھ ہی اسی خوب صورت بنگلے میں کھولی تھی۔ وقت کا پنچھی پر لگا کر اڑتا رہا اور حالات کی تلخیوں نے شبانہ کی تمام تر خوش فہمیاں نوچ ڈالیں اور آہستہ آہستہ ٹھوس حقیقتوں کے پردے اٹھتے چلے گئے۔ ان دونوں کو اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ ڈرائیور روزانہ ان کو چھوڑ بھی آتا اور لے بھی آتا۔ نرسری اور پریپ کلاس تو ان کی بہت اچھی اور خوش حال گزری لیکن جب وہ اول کلاس میں ہوئیں تو ان کو الگ کر دیا گیا۔

ایک دن انسپکٹر عابد کی بیوی رابعہ نے اپنے شوہر سے کہا:

”ہماری نوکرانی کی بیٹی شبانہ ہماری بیٹی کو خراب ہی نہ کر دے، اگر اسی طرح وہ اکٹھی کھیلتی اور اسکول آتی جاتی رہیں تو نوکرانی کی

زندگی کے ابتدائی مراحل میں کھیلنا انسانی جسم اور عقل کی بڑھوتری میں کافی جدت پیدا کرتا ہے، لیکن خواہشات سے بھرپور اس بے فکری کے دور میں جب کوئی کھلونوں کی بجائے جذبات سے کھیلنا شروع کرتا ہے تو اس کا انجام عبرت ناک ہوتا ہے۔ آنے والے لمحات میں عارضی سنہری خوشیوں کی گرد کا گمان مصیبتوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے کا روپ دھار سکتا ہے۔

شبانہ نے ایک خوب صورت بنگلے میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کے امی ابو بنگلے والوں کے ملازم تھے۔ اس لیے انسپکٹر عابد نے انہیں اپنے بنگلے میں ہی رہنے کے لیے ایک کمرہ دیا ہوا تھا۔ اس کی پیدائش کے چند ماہ بعد ہی اس کے ابو کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی ماں حمیدہ نے اس کا نام شبانہ رکھا تھا۔ ابھی وہ چھ ماہ کی تھی کہ بنگلے والے انسپکٹر کے گھر میں بھی ایک پھول سی بچی نے جنم لیا۔ انسپکٹر اور اس کی بیوی بہت خوش تھے۔ انہوں نے اپنی بیٹی کا نام امبر رکھا۔ اگرچہ شبانہ ان کی نوکرانی حمیدہ کی بیٹی تھی لیکن



بیٹی ہماری بیٹی کو نوکروں والی عادتیں سکھا دے گی، جب کہ میں نہیں چاہتی کہ ایسا ہو، کیوں کہ مائی حمیدہ ہمارے گھر ملازمہ ہے اور ہم اتنی بڑی جائیداد کے مالک ہیں اس لیے ہمارے اور ہمارے بچوں کے رہن سہن میں بھی فرق ضرور ہونا چاہیے۔“

رابعہ مزید بولیں:

”دیکھیے انسپکٹر صاحب! آپ ایسا کریں کہ مائی حمیدہ کو بنگلے سے الگ کر دیں اور پیچھے کوارٹر میں رہنے کے لیے کہیں تاکہ ہمارے بچوں پر ان کا اثر نہ پڑے۔“

انسپکٹر عابد نے بیوی کی ہاں میں ہاں ملائی اور کہا کہ بیگم آپ فکر نہ کریں، میں کل ہی حمیدہ کو یہ سب کہہ دیتا ہوں۔ دوسرے دن صبح ہی انسپکٹر عابد نے مائی حمیدہ کو بلوایا اور اس سے کہنے لگے:

”دیکھو حمیدہ! اب تک ہم نے آپ کو اپنے ساتھ رکھا ہے، اب جب کہ ہماری بیٹی سمجھ دار ہو چلی ہے، ہمیں خطرہ ہے کہ وہ ہماری بیٹی کو نوکرانیوں والی عادتیں نہ سکھا دے۔ اگر تم یہاں کام کرنا چاہتی ہو تو اپنی بیٹی سمیت گھر کے پیچھے کوارٹر میں منتقل ہو جاؤ اور اپنی بیٹی شبنم کو اسکول بھیجنے کا بندوبست بھی آپ خود کریں گی۔“

اتنا کہہ کر انسپکٹر صاحب ڈیوٹی پر چلے گئے۔

عابد کے یہ الفاظ حمیدہ مائی کی سماعت پر ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے، اس کو بار بار انسپکٹر صاحب کا آرڈر یاد آ رہا تھا۔ وہ احساس کمتری کا شکار ہوتی چلی گئی اور آسمان کی طرف منہ کر کے بولی:

”اے اللہ کیا ہم تیری مخلوق نہیں ہیں، اگر ہمیں اتنی نفرت کا سامنا کروانا تھا تو ہمیں پیدا ہی نہ کرتا..... ہمارا وجود ہی کیوں تخلیق کیا.....“ اور اسی کے ساتھ ہی مائی حمیدہ نے اپنا سارا سامان سمیٹا اور بنگلے کے پیچھے کوارٹر میں منتقل ہو گئی۔

چھٹی کے بعد جب امبر اور شبنم اسکول سے واپس آئیں تو آپس میں کھیل رہی تھیں کہ مسز رابعہ نے انہیں علیحدہ کر دیا اور شبنم کو حکم دیا کہ وہ اپنی ماں کے پاس چلی جائے اور آئندہ امبر کے ساتھ کبھی نہ کھیلے۔ شبنم اپنی سہیلی کو چھوڑ کر اپنی ماں کے پاس کوارٹر میں آ گئی۔ اب شبنم کو امبر کے ساتھ کھیلنے پہ بھی پابندی لگ گئی تھی۔ اب نہ تو شبنم کے پاس کھلونے تھے اور نہ گڑیاں تھیں جن سے وہ

کھیلتی۔ شبنم کے معمولات اب یکسر بدل چکے تھے۔ پچھلے دو سال سے وہ گاڑی پر اسکول جاتی تھی جب کہ اب اس کی امی صبح اسے اسکول چھوڑ آتی تھیں اور واپسی پر وہ بازار کی گلیوں سے ہوتی ہوئی اپنے کوارٹر میں آتی تھی۔ اسکول میں بھی امبر اور شبنم نہیں ملتی تھیں۔ امبر نے اپنی نشست تک بدل لی تھی کیوں کہ اس کے دل و دماغ میں بھی شبنم کے لیے نفرت کا بویا ہوا بیج اُگ چکا تھا۔

ایک دن شبنم اسکول سے گھر آ رہی تھی تو اس نے بازار میں ایک بڑے سے جنرل اسٹور پر ایک خوب صورت سی گڑیا دیکھی جو ایک بڑے سے شوکیس میں بھی ہوئی تھی۔ جب اس کی نظر گڑیا پر پڑی تو وہ دیکھتی چلی گئی۔ اس کے دماغ میں ماضی گھوم کر رہ گیا جب وہ قیمتی کھلونوں اور گڑیوں سے کھیل کرتی تھی۔ کافی دیر وہ گڑیا کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی اور پھر گھر کی طرف چل پڑی۔ پھر تو یہ روز کا معمول بن گیا، جب بھی وہ اسکول سے واپس آتی تو اس دکان کے سامنے رک کر کافی دیر تک اس لال گڑیا کو دیکھتی رہتی اور پھر گھر کی راہ لیتی۔ اس کے دل میں بھی گڑیا لینی کی خواہش پیدا ہو چکی تھی۔

آج جب وہ اسکول سے چھٹی کے بعد گھر پہنچی تو اپنی ماں سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔ اس کی ماں نے کہا کہ بیٹا اگلی تنخواہ پر لے دوں گی، ابھی تو میرے پاس پیسے بھی نہیں ہیں۔ جتنی تنخواہ ملتی ہے اس سے زیادہ تو اخراجات ہیں ہمارے، ابھی کچھ دن صبر کرو۔ اب شبنم اگلے ماہ کا انتظار کرنے لگی۔ آخر جب اگلی تنخواہ ملی تو شبنم نے اپنی ماں کو وعدہ یاد دلایا مگر اس بار بھی مائی حمیدہ نے کہا کہ کسی کا ادھار لیا ہوا تھا، وہ ادا ہوا ہے۔ اب میرے پاس کچھ نہیں بچا جو تمہیں گڑیا دلوادوں، اس لیے اس بار نہیں اگلی بار اپنی چاند جیسی بیٹی کو گڑیا لے کر دوں گی۔ اس طرح تقریباً چار ماہ گزر گئے اور شبنم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے اپنی ماں سے کہا کہ مجھے ہر حال میں گڑیا لے کر دیں اور اس نے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ یہ سب دیکھ کر مائی حمیدہ بہت پریشان ہو گئی کیوں کہ اس کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی جس سے وہ اپنی بیٹی کو گڑیا لے کر دیتی لیکن وہ اپنی بیٹی کو اس حال میں بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔



سڑک کے درمیان میں ڈیرے ڈال رکھے ہیں..... اب اٹھ بھی جا.....۔“

لیکن وہ ایسے پڑی تھی جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے بڑی مونچھوں والے شخص نے کوچوان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

”ارے بھائی! اتنی بھی کیا جلدی ہے....؟ پانچ منٹ پہلے کیا اور پانچ منٹ بعد کیا... پہلے دیکھ تو سہی جا کر کہ وہ کیوں پڑی ہے۔“

کوچوان نے تانگہ روکا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کی جانب یوں بڑھا جیسے زمین ناپ رہا ہو۔ اتنے میں بڑی مونچھوں والا آدمی جو کسی گاؤں کا چوہدری معلوم ہوتا تھا اور شام کو گھر جا رہا تھا وہ بھی تانگے سے اتر آیا اور اس اجنبی عورت کو بے ہوشی کی حالت میں دیکھا تو اسے اٹھا کر تانگے کی پچھلی سیٹ پر رکھا اور پھر وہ قریبی اسپتال کی طرف بڑھ گئے۔ ڈاکٹر ڈیوٹی پر ہی تھا۔ اس نے

کافی سوچ بچار کے بعد مائی حمیدہ نے قریبی ڈاکٹر کے بنگلے پر کام کرنا شروع کر دیا۔ دن کو انسپکٹر کے بنگلے پر کام ختم کرنے کے بعد وہ شام کو ڈاکٹر کے بنگلے پر اوور ٹائم لگا رہی تھی۔ وہ رات کو عشاء کے بعد گھر لوٹی۔ وہ ایسا صرف اور صرف اپنی بیٹی کی خاطر کر رہی تھی کیوں کہ جو اوور ٹائم کے پیسے ملنے تھے ان پیسوں سے مائی حمیدہ نے اپنی بیٹی کو گڑیا دلوانی تھی۔ اب تو شبانہ خوش تھی کیوں کہ اب اسے یقین تھا کہ اس کی ماں اس کو لال گڑیا ضرور دلوائے گی۔

آج جب مائی حمیدہ ڈاکٹر کے بنگلے پر کام کرنے گئی تو ان کے مہمان آئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر کی بیوی نے مائی حمیدہ کو پچھلے ہفتے کی چار سو روپے تنخواہ دے کر جلدی واپس بھیج دیا، چنانچہ آج وہ بہت جلدی واپس آ رہی تھی۔ وہ بہت زیادہ خوش تھی اور تصور ہی تصور میں اپنی بیٹی شبانہ کو اس لال گڑیا سے کھیلتا دیکھ رہی تھی۔ وہ اسی خوشی میں سڑک پر چلی آ رہی تھی، اسے ارد گرد کے ماحول کا کچھ

پتا نہیں تھا کہ اتنے میں ہوا سے باتیں کرتی ہوئی تیز رفتار کار پیچھے سے آئی اور اسے ٹکرا کر شام کے اندھیروں میں گم ہو گئی۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے کار کا نمبر بھی کوئی نوٹ نہ کر سکا، اس وقت سڑک پر لوگوں کا رش بھی نہیں تھا۔ وہ زخمی ہو کر بے ہوش ہو گئی۔

ابھی وہ بے ہوشی کی حالت میں ہی پڑی تھی کہ پیچھے سے سواریوں سے لدا ایک تانگہ آیا۔ ابھی تانگہ کچھ پیچھے ہی تھا کہ کوچوان نے گلہ پھاڑتے ہوئے کہا:

”اری او پگی! مرنے کا ارادہ ہے کیا..... یا پھر سڑک کو باپ کی ملکیت سمجھ رکھا ہے.....“





میں پوچھا۔ پہلے تو مائی حمیدہ ٹالتی رہی مگر جب شبانہ نے ضد کی تو مائی حمیدہ کو اس کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے اور آج ہونے والا سارا واقعہ اپنی بیٹی کے گوش گزار کر دیا جسے سن کر وہ رونے لگی اور اپنی ماں سے معافی مانگی اور بولی:

”بس..... مجھے گڑیا نہیں چاہیے... میری ساری کائنات میری ماں تو ہی ہے۔ آئندہ میں گڑیا کا نام تک نہیں لوں گی... مجھے برائے مہربانی دل سے معاف کر دیں ماں..... ماں تو نے میری خواہش کی خاطر اپنی جان کی پرواہ بھی نہ کی اور اپنی زندگی داؤ پر لگا دی..... مجھے آج سے گڑیا اور کھلونوں سے نفرت ہو گئی ہے.... ماں تیرا سایہ مجھ پر ہمیشہ قائم رہے اور مجھے اس دنیا کی کوئی چیز نہیں چاہیے۔“

شبانہ اتنا ہی کہہ پائی تھی، شاید وہ اپنی ماں سے اور بھی محبت کا اظہار کرتی مگر وہ اپنی آنکھوں میں آنسو لیے نیند کی حسین وادیوں میں کھو گئی، کیوں کہ اس نے صبح جنرل اسٹور میں پڑی گڑیا کو نفرت کی نگاہ سے جو دیکھنا تھا اور وہ اب جان چکی تھی کہ پہلے رشتے پیارے ہیں جب کہ کھلونے اور چیزوں کی اس کے سامنے کوئی اہمیت نہیں۔

آخر میں فیصلہ قارئین پر بھی ہے کہ کون پہلے ہونا چاہیے... رشتے، جذبات.... یا پھر..... کھلونے.....؟  
☆.....☆.....☆



اس کا چیک اپ کیا اور پھر نرس نے اس کو انجکشن لگائے اور مرہم پٹی کی۔ چوہدری بڑانیک دل تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو بل ادا کر دیا اور تانگے والے کو کرایہ بھی دے دیا اور کہا کہ جب مریضہ کو ہوش آ جائے تو اسے اس کے گھر چھوڑ آئے۔

ادھر شبانہ آج بہت خوش تھی کیوں کہ اس کی ماں کو آج ڈاکٹر کی طرف سے پچھلے ہفتے کے پیسے ملنے تھے جن سے اس کے لیے لال گڑیا آنا تھی، لیکن وہ پریشان بھی بہت تھی کیوں کہ اس کی ماں ابھی تک گھر نہیں پہنچی تھی۔ وہ کوارٹر سے نکل کر بار بار اپنی ماں کی راہ دیکھ رہی تھی، آخر جب کافی دیر تک بھی اس کی ماں نہ آئی تو وہ بہت ڈرنے لگی اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ جانے اس بے چاری کے آنسوؤں میں گڑیا کی خوشی چھپی تھی۔ اس کا دل انجانے خوف سے لرز رہا تھا۔

ادھر مائی حمیدہ نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ کوچوان جو مریضہ کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا تھا، وہ یہ آواز سنتے ہی بھاگا چلا آیا۔ کوچوان نے پوچھا کہ کیسی ہو بہن جی...؟ اور بتایا کہ مجھے چوہدری جی کرایہ دے کر گئے ہیں اور ساتھ کہہ کر گئے ہیں کہ جب مریضہ کو ہوش آ جائے تو اسے گھر چھوڑ کر آنا۔ اس نے مائی حمیدہ کو اس کے کوارٹر پر اتارا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

کوارٹر کے ٹوٹے پھوٹے لکڑی کے دروازے پر ایک آہستہ سی دستک نے چاروں طرف پھیلی خاموشی کو توڑ ڈالا۔ کوارٹر کی اندرونی دیوار پر پرانا سا زنگ آلود وال کلاک رات کے بارہ بجنے کا اعلان کر رہا تھا۔ آج شبانہ کو نیند کب آنے والی تھی، نیند تو اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس نے لپک کر دروازہ کھولا اور ایک ہلکی سی چرچراہٹ سے دروازے کا ایک پلڑا کھل گیا جب کہ دوسرا پلڑا ٹوٹا ہونے کی وجہ سے دیوار کے ساتھ جیسے فٹ ہو چکا تھا۔

سامنے کا منظر دل دہلا دینے والا تھا، شبانہ کی ماں کے سر بندھی پٹی سے جھانکتا ہوا خون کسی حادثے کی پیش گوئی کر رہا تھا۔ اپنی ماں کو اس حالت میں دیکھ کر شبانہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئی اور حادثے کے بارے



فرزانہ چیمہ



”ردی اخبار والا..... ردی اخبار والا.....“

”ایک منٹ یار! برا نہ منانا۔ میں ذرا ردی بیچنے والے کو روک لوں۔“ وقاص جلدی سے گھر کا دروازہ کھول کر سڑک پر نکل گیا اور ذرا سی دیر میں ردی والے کو بلا لایا۔ ساتھ ہی جھٹ پٹ گھر کے اندر جا کر رسائل و اخبارات کا ڈھیر اٹھا لایا۔

”اتنے بے شمار رسالے آتے ہیں تمہارے گھر؟“ علی نے دل چسپی سے چند رسالے اٹھا کر دیکھے۔ ”ارے! یہ تو انگریزی کے کوئی بھاری بھاری رسالے اور کتابیں ہیں۔ کون پڑھتا ہے یہ تمہارے گھر میں؟“

”پڑھتا وڑھتا کوئی نہیں..... یہ تو میرے بھائی جان اپنے دفتر سے لائے ہیں۔“

”دفتر سے؟“ علی نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں یار! ان کے دفتر میں ان کے چیئر مین کے نام بہت ساری ڈاک آتی ہے جس میں مختلف اخبارات اور رسائل بھی ہوتے ہیں۔ بھائی جان مہینے دو مہینے بعد یہ بنڈل گھر لے آتے ہیں تاکہ ردی میں فروخت کر دیں۔“

”کتنے پیسے مل جاتے ہیں؟“ علی نے پوچھا۔

”مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ خیر بتائے دیتا ہوں کہ یہی کوئی سو ڈیڑھ سو روپے کی ردی بک جاتی ہے۔“ وقاص نے جواب دیا۔ ”تمہارے بھائی جان اپنے چیئر مین صاحب کی اجازت سے یہ سب اٹھاتے ہیں؟“

”ارے تو بہ کرو علی! ان سے پوچھ کر کیوں؟ ایسی باتیں پوچھنے والی ہوتی ہیں بھلا؟ بھائی جان کہتے ہیں کہ یہ وہاں بے مقصد پڑے رہتے ہیں۔ مہینہ دو مہینہ انتظار کرتا ہوں، جب کوئی بھی ان سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو میں گھر لے آتا ہوں۔“

”میرے خیال میں تو یہ بددیانتی ہے۔ ان کا فروخت کرنا..... ان کا پیسہ لینا جائز نہیں ہے۔“

”بھئی! ایک چیز وہاں بے کار پڑی ہے۔ اگر ہمارے استعمال

میں آجائے تو کیا حرج ہے؟“ وقاص نے حیرت سے پوچھا۔

”حرج تب نہیں وقاص! جب ہم اس کے مالک سے اجازت لیں۔ بغیر اجازت کسی کی بے کار سے بے کار چیز لینا یا اسے فروخت کر دینا میرے خیال میں ناجائز ہے۔ آگے اپنی مرضی کرو۔ میں کون



### ملکت کی تم تقدیر ہوا!

اقبال کی تعبیر ہو  
قائد کی تم تصویر ہو  
تم نعرہ تکبیر ہو  
تم ہو ہماری بحریہ  
تم جراتوں کے پاسباں  
تم ہمتوں کی ہو چٹاں  
اور نور کی تفسیر ہو  
تم ہو ہماری بحریہ  
باطل سے تم ڈرتے نہیں  
پیچھے کبھی ہٹتے نہیں  
دشمن پہ تم شمشیر ہو  
تم ہو ہماری بحریہ  
امنٹ تمہارے حوصلے!  
نہ مٹ سکیں، نہ چھپ سکے  
قدرت کی تم تحریر ہو  
تم ہو ہماری بحریہ

نیم ادیب

سامفتی ہوں یا شہر کا قاضی ہوں۔ ایک بات صحیح سمجھی، تمہیں خلوص سے بتادی۔ آگے تم جانو اور تمہارا کام، میں اب چلتا ہوں۔“

”ارے یار! کچھ دیر ٹھہرو تو سہی۔ گڑ کا حلوہ بنواتا ہوں، وہ کھا کے جانا۔“

”پھر کبھی سہی۔ مغرب کی اذان بھی ہونے والی ہے۔“ علی نے مسکراتے ہوئے اجازت لی اور گھر آ گیا مگر وقاص کے دل میں ایک کھٹک سی پیدا ہو گئی۔ اس نے کچھ سوچا، پھر ردی والے سے معذرت کر کے اسے واپس بھیج دیا اور ردی کا ڈھیر اٹھا کر سٹور میں رکھ آیا۔

”کتنے کی ردی فروخت ہوئی پتر؟“ وقاص کی والدہ نے چاول صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

”ردی نہیں بیچی ماں!“ وقاص آہستہ سے آکر ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

”کیوں؟“ خود ہی تو ردی والے کو بلا کر لائے تھے، پھر کیا ہوا؟ کیا بھاؤ نہیں بنا؟“

”نہیں اماں! ایسی کوئی بات نہیں دراصل علی کہتا ہے کہ یہ سب کچھ جائز نہیں ہے۔ جس چیز پر ہمارا حق نہ ہو، ہماری ملکیت نہ ہو، اسے فروخت کرنا بددیانتی ہوگی اور اس سے حاصل شدہ روپیہ پیسہ یا آرام، فائدہ سب کچھ حرام ہے۔“

وقاص کی والدہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ وقاص نے ماں کا کندھا ہلایا۔ ”ماں! علی ٹھیک کہتا ہے نا؟ میرا دل بھی یہی کہتا ہے کہ علی ٹھیک کہہ رہا ہے، اسی لیے میں سب اخبار رسالے واپس سٹور میں رکھ آیا ہوں۔“

”ہاں بیٹا! علی بالکل صحیح کہہ رہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کی خاطر نہ جانے کیوں ہماری آنکھوں پہ پٹی بندھ جاتی ہے۔ ہم خود نہیں سوچتے کہ یہ کام جائز ہے یا نہیں۔ بس اپنی خواہش..... اپنی ضرورت سب سے پہلے سامنے آتی ہے۔ کیا ہوا جو تمہارا باپ نہیں رہا۔ کیا ہوا جو تیرا بھائی ایک معمولی ملازمت پہ ہے۔ کیا ہوا جو ہمارا دو کمروں کا گھر ہے۔ ہمیں مسلمان تو رہنا چاہیے..... ہمیں ایمان تو نہیں بیچنا چاہیے۔ پتر! علی بالکل ٹھیک کہتا ہے..... اچھا سن! یہ سو روپیہ لے اور جا کر محلے کی مسجد میں دے آ۔“ وقاص کی والدہ نے دوپٹے کے پلو سے سو کا نوٹ نکالا۔

”یہ کس بات کا ماں؟“ وقاص نے حیران ہو کر پوچھا۔

”بیٹا! کوئی تین چار ماہ سے ہی تمہارا بھائی ردی لے کر آ رہا ہے۔ اب میں چھ ماہ تک سو روپیہ ماہانہ مسجد میں دے دیا کروں گی تاکہ پچھلا حساب بھی صاف ہو جائے۔ وقاص پتر! ان سانسوں کا کوئی بھروسا نہیں۔ جانے کب بند ہو جائیں۔ کب موت کا وقت آ جائے۔ ہمیں اپنا حساب کتاب ہر وقت اور ہر ایک سے صاف رکھنا چاہیے۔“

”ہاں ماں! یہ تو ہے۔“ وقاص نے سو روپے کا نوٹ پکڑ کر احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ ماں نے محبت سے وقاص کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولیں۔

”وقاص! علی کو ہمیشہ اپنا سب سے عزیز دوست رکھنا۔ دیکھو! آج اس نیک سیرت بچے نے کیسے ہمیں روشنی دکھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے دونوں جہانوں میں خوش رکھے اور ہاں! شہباز گھر آئے تو اسے کہہ دینا کہ جیسے یہ اخبار و رسائل دفتر سے لایا ہے، ویسے ہی کل اٹھا کر واپس رکھ آئے۔ ہمیں نہیں چاہیے اس طرح کا مال و متاع۔ ہمیں حلال رزق چاہیے، تھوڑا ہو لیکن صاف ستھرا ہو۔ کسی بھی شک شبہ سے پاک ہو تو اسی رزق میں لذت بھی ہوتی ہے..... راحت بھی..... اور برکت بھی۔

☆☆☆



## اچھے عہد کریں!



زہرا خاتون ایک سلجھی ہوئی خاتون ہیں۔ ان کا تعلق ایک کھاتے پیتے زمین دار گھرانے سے ہے۔ ان کی زمینوں کی دیکھ بھال جلال خان کیا کرتے ہیں۔ آج وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ زہرا خاتون کے گھر آئے۔ زہرا خاتون نے ان کی بہت اچھی طرح خاطر تواضع کی۔ ان کو رخصت کرتے وقت انہوں نے انہیں خالی ہاتھ بھیجنا مناسب نہ سمجھا۔ لہذا انہوں نے اپنی بیٹی عائشہ سے کہا کہ ان کے لیے تحائف کا بندوبست کیا جائے۔ دونوں ماں بیٹیاں گھر کے استور میں گئیں اور ٹرنک میں سے کپڑے نکالنے لگیں۔ عائشہ نے ایک سوٹ نکالا اور کہا:

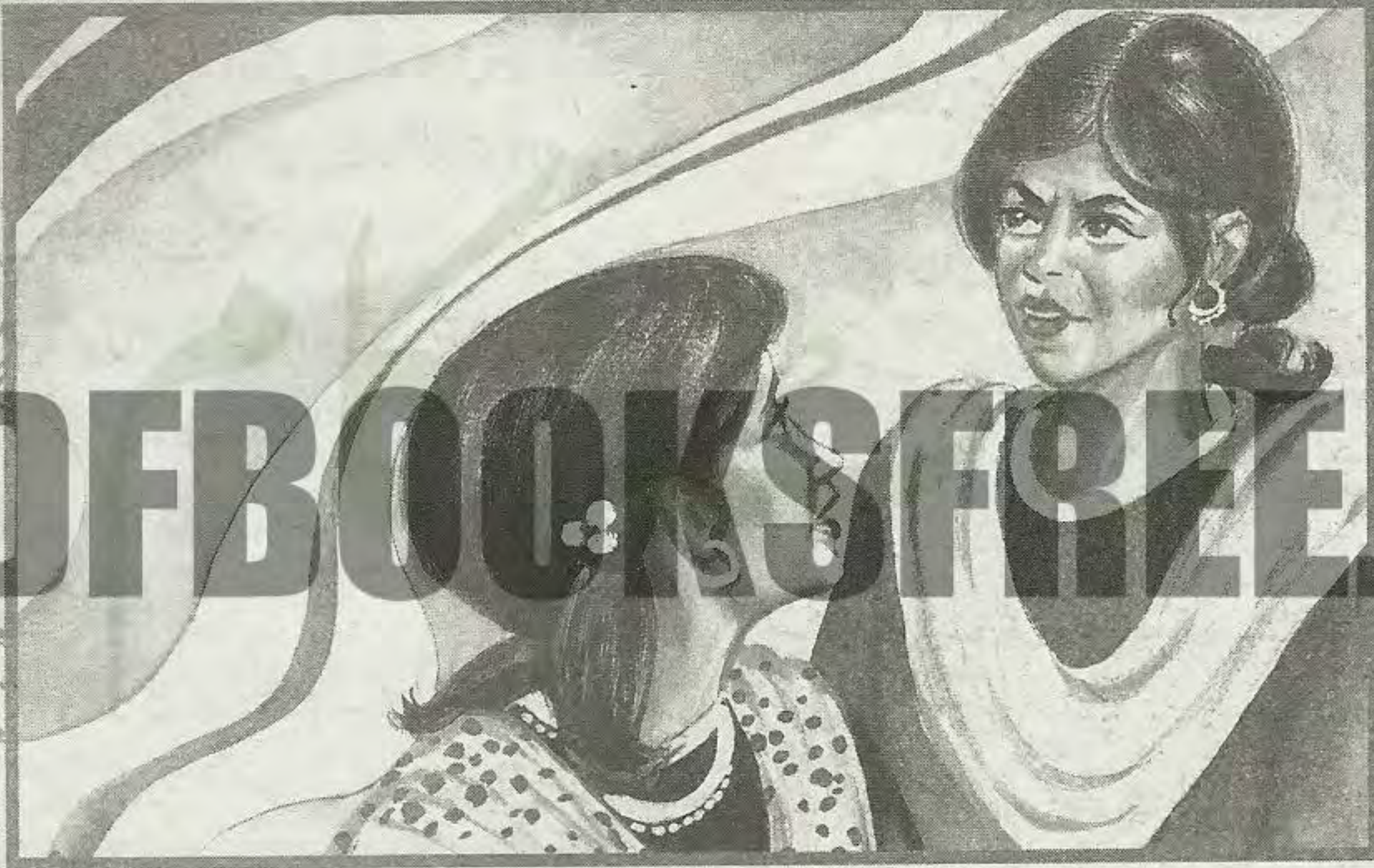
”امی جان! یہ سوٹ دے دیں؟ اس کا رنگ اور ڈیزائن مجھے پسند نہیں۔“

امی جان نے ناگواری سے عائشہ کی طرف دیکھا اور کہا:

”بیٹی حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوگا جب تک اپنے (مومن) بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ تو بیٹی ہمارے پیارے نبیؐ نے کتنی خوب صورت بات کہی ہے۔ سب انسان برابر ہیں کسی کو حقیر سمجھ کر ایسی چیز نہ دو جو تمہیں پسند نہ ہو۔“

عائشہ بہت شرمندہ ہوئی۔ اس نے فوراً اپنا پسندیدہ کپڑوں کا جوڑا نکالا اور جلال خان کی بیوی کے لیے خوب صورت لفافے میں ڈال دیا۔ دونوں ماں بیٹیوں نے جلال خان اور اس کی بیوی کو پیار اور محبت سے رخصت کیا۔

پیارے بچو! آپ بھی عہد کریں کہ ہمیشہ دوسروں کے لیے وہی چیز پسند کریں جو اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔



**شباباش** ان بچوں نے عہد کیا ہے کہ جب بھی یہ بچے مسجد میں جائیں تو مسجد کے تقدس و تکریم کا احترام کریں گے۔

محمد حذیفہ، وارث وکیل، عائشہ کرن، زرتاشہ گل، وقار ساحر، محمد آکاش، فوزیہ وکیل، صوبیہ انصاری، محمد وکیل، دریا خان۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ احمد حسام الدین، لاہور۔ صبیح الحسن، سیال کوٹ۔ ثمرہ طارق بٹ، گوجرانوالہ۔ احمد رضا انصاری، کوٹ ادو۔ الودود شامی، عبداللہ ہاشم، لاہور۔ سمیع اللہ، لیٹی۔ احسن اعجاز، فراست علی، کراچی۔ عبدالوہاب، الٹ۔ محمد عاقب، چکی شیخ جی۔ تحریم الاسلام، سرگودھا۔ محمد سلطان سرفراز، ملتان۔ حسین احمد ورک، راول پنڈی۔ عبداللہ شاہ، دریا خان۔ سمیط رضا، شہربانو، لاہور۔ عاصم طفیل، گوجرانوالہ۔ لائبہ عابد، کراچی۔ ذیشان کاشف، سرگودھا۔ عشاء افضل، گوجرانوالہ۔ عشاء سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ شہزاد حیدر شیخ، لاہور۔ وجیہہ الدین، کوہاٹ۔ محمد ہاشم اسلم، گوجرانوالہ۔ عدیرہ علیم عامر، رحیم یار خان۔ مطیع الرحمن، صفی الرحمن، لاہور۔ حبیب نواز قادری، محمد ذیشان اکرم، کاموکی۔ راجہ ثاقب محمود، پنڈ دادنخان۔ فاطمہ سلیم، لاہور۔ عائشہ سعید، راہوالی۔ زینب محمود، گوجرانوالہ۔ محمد کلیم، بھکر۔ زینب ناصر، فیصل آباد۔ عذرہ سعید، چکی شیخ جی۔ فرحین انور، احمد پور شرقیہ۔ حسن رضا سردار، کاموکی۔



راشد علی زار ب شاعر



# پیارے اللہ کے پیارے نام

کی طرح خود بخود بند ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں پردوں کے ساتھ پلکوں کے بال چوکی داروں کی صورت کھڑے کر دیئے تاکہ گردوغبار، مکھی، مچھر آنکھ میں نہ جانے پائے اور پھر پلکوں کے ساتھ بھنووؤں کے بال رکھ دیئے، اگر اوپر سے کوئی چیز آئے تو براہ راست آنکھ میں نہ پڑے۔ یہ وہ البصیرُ جَلَّ جَلَالُہ ہے جس نے اپنی پیاری نعمت عطا فرمائی ہے۔

## آنکھیں

اللہ تعالیٰ نے ایسی مخلوق بھی پیدا فرمائی ہے جن کی آنکھیں نہیں ہیں مگر وہ جانور اپنے کانوں یا پنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ بچھو اپنے کانوں سے دیکھنے کا کام لیتا ہے اور سانپ اپنی آنکھوں سے سننے کا کام لیتا ہے۔ بعض کیڑے مکوڑے اپنے سر کے اوپر جو دو زاویے بنے ہوتے ہیں، ان سے دیکھنے کا کام لیتے ہیں۔

## دودھ اور پانی

ایک مرتبہ کا ذکر ہے امیر المومنین حضرت عمرؓ رات کو گلی میں چکر لگا رہے تھے۔ ایک گھر میں ایک بوڑھی ماں اپنی بیٹی سے باتیں کر رہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے غور کیا تو پتا چلا کہ وہ بڑھیا اس لڑکی سے پوچھ رہی تھی: ”کیا بکری نے دودھ دے دیا؟“

## البصیرُ جَلَّ جَلَالُہ (سب کچھ دیکھنے والا)

وہ بہت باریک اور چھوٹی ہو۔ وہ رات کے وقت سخت چٹان پر ریگنے والی چیونٹی کو بھی دیکھتا ہے اور وہ ساتوں زمینوں کے نیچے بھی اسی طرح دیکھتا ہے جیسے ساتوں آسمانوں کے اوپر دیکھتا ہے۔

یہ نام قرآن کریم میں بیالیس 42 مرتبہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سمندر کی گہرائیاں اور رات کی تاریکیاں سب کو دیکھتا ہے۔ ہم جہاں کہیں بھی چلے جائیں، وہ ہمارے ساتھ ہے اور ہر جگہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔

## آنکھیں بڑی نعمت ہیں

البصیرُ جَلَّ جَلَالُہ وہ ذات ہے جس نے کان کی ہڈی کو سننا، آنکھ کی چربی کو دیکھنا اور زبان کے گوشت کو بولنا سکھایا۔ سب کچھ دیکھنے والے نے دیکھنے کے لیے ہمیں آنکھیں دی ہیں۔ آنکھ کو چہرے کے اندر بڑے عجیب و غریب انداز سے رکھا۔ آنکھ کے اوپر ایک سخت ہڈی ہے اور آنکھ کے نیچے رخسار کی ہڈی ہے۔ دونوں ہڈیاں ابھری ہوئی ہیں۔ خدا نخواستہ کہیں ٹھوکر لگ کر گر جائیں تو یہ ہڈیاں آنکھ کو بچا لیتی ہیں۔ دونوں آنکھوں پر چڑے کے ہلکے ہلکے پردے لگا دیئے۔ اگر کوئی چیز اس طرف آتی ہے تو آٹومیٹک مشین



اس نے کہا: ”جی دے دیا۔“ پھر بڑھیا نے پوچھا: ”کتنا دودھ دیا ہے؟“ لڑکی نے کہا: ”تھوڑا سا دیا ہے۔“ وہ کہنے لگی: ”کہ مانگنے والے تو پورا مانگیں گے، اس لیے تم اس میں پانی ملا دو۔“ اس نے کہا: ”امیر المومنین نے پانی ملانے سے منع کیا ہوا ہے اس لیے میں تو نہیں ملاتی۔“ وہ بڑھیا کہنے لگی: ”کون سا امیر المومنین دیکھ رہے ہیں؟“ لڑکی نے کہا: ”ماں! اگر امیر المومنین نہیں دیکھ رہے تو امیر المومنین کا پروردگار تو دیکھ رہا ہے۔“

خلیفہ دوم امیر المومنین حضرت عمرؓ نے ان کا یہ مکالمہ سنا اور گھر آگئے۔ آپؓ نے صبح اس بڑھیا کو بھی بلوایا اور اس کی لڑکی کو بھی۔ اس لڑکی کے تقویٰ کی بنیاد پر آپؓ نے اسے اپنی بہو کے طور پر پسند فرمالیا۔ چنانچہ آپؓ نے اپنے بیٹے کے لیے اس کا رشتہ مانگا اور وہ آپؓ کی بہو بن گئی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو بعد میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے مشہور عادل و زاہد کی نانی بنی۔

### پندرہ سال پہلے

ٹرین، نواب شاہ اسٹیشن پر رکی تو مسافروں سے کچا کھج بھری ہوئی تھی۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ عید الفطر کے موقع پر لوگ کراچی سے اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ بشیر صاحب اپنے پوتے عابد کے ساتھ گاڑی میں سوار ہونے کی کوشش میں تھے۔ انہیں گاڑی میں کہیں سے بھی سوار ہونے کے لیے جگہ نہ مل سکی۔ انہوں نے نواب شاہ سے کچھ ہی دور جانا تھا۔ ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن تک کا سفر تھا جو تقریباً 25 کلو میٹر تھا۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ پندرہ سالہ عابد کو لے کر سوار ہو سکیں۔ اتنے میں گاڑی نے ہارن بجا دیا۔ جلدی سے ایک دروازے سے انہوں نے گھسنے کی کوشش کی مگر اندر کے مسافروں نے بشیر صاحب کو اندر داخل نہ ہونے دیا۔

”بابا جی کسی اور ڈبے میں جاؤ۔“ وہ چیخے۔ ”انسانیت ہی نہیں ہے۔“ گاڑی میں سوار نہ ہونے پر وہ بڑبڑائے۔ گاڑی چلنے لگی۔

”بابا یہاں ہمارے پاس آ جائیں۔“ سلپیر ڈبے کے مسافر نے بابا کو اوپر کھینچتے ہوئے کہا۔ بالآخر وہ سلپیر ڈبے میں سوار ہو گئے۔

”بیٹا! اس سلپیر کلاس کا ٹکٹ نہیں ہے، عام درجے کا ٹکٹ لیا ہے۔“ انہوں نے سوار ہو کر کہا۔ ”آج کل کون پوچھتا ہے اور کون

دیکھتا ہے؟“ اس نوجوان مسافر نے کہا۔

”لیکن بیٹا! اللہ تو دیکھ رہا ہے۔ چلو ٹکٹ چیکر آئے گا تو اس سے ٹکٹ بدلوا لیں گے۔“ اور پھر وہ ایئر کنڈیشنر کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں مزے سے سفر کرنے لگے۔ پچیس منٹ کے سفر میں ٹکٹ چیکر نہیں آیا تو وہ اپنے اسٹیشن پر اتر گئے۔ گاڑی سے اتر کر انہوں نے ٹکٹ گھر سے سلپیر ڈبے کی دو ٹکٹیں خریدیں اور انہیں پھاڑنے لگے۔

”دادا جان! یہ کیا؟ انہیں کیوں پھاڑ رہے ہیں؟“ عابد نے پوچھا۔ ”بیٹا! جس ڈبے میں ہم نے سفر کیا اس درجے کا ٹکٹ ہمارے پاس نہیں تھا اور ہم نے سفر ایئر کنڈیشنڈ ڈبے میں کیا۔ اس لیے تمہارا اور اپنا ٹکٹ خرید کر اسے پھاڑ رہا ہوں۔ اس طرح یہ پیسے ریلوے پاکستان تک پہنچ گئے اور چوں کہ اب یہ ٹکٹ بے کار ہیں، اس لیے اب انہیں ضائع کر رہا ہوں۔“ ”دادا جان! ہمیں اب کون دیکھ رہا ہے؟ اب تو ہم اپنے شہر میں آ گئے تو اب کون پوچھ سکتا ہے ہم سے؟“ عابد نے معصومانہ انداز میں کہا۔

”مگر بیٹا! وہ اللہ تعالیٰ تو ہمیں دیکھ رہا۔ حق دار کو اس کا حق پہنچانا ضروری ہے۔ جس حق دار کے حق کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہ ہوگا تو اس کا مطالبہ اللہ تعالیٰ ضرور کرتے ہیں۔ اپنے اللہ کو تو ہمیں منہ دکھانا ہے۔“ اور آج 15 سال بعد من و عن یہی صورت حال جوان عابد کو درپیش تھی۔ اس کی آنکھیں ماضی میں جھانک جھانک کر اس واقعے کو دیکھ رہی تھیں۔

”یار! ٹکٹ نہ لوں..... کیا حرج ہے۔“ عابد نے اپنے دل میں کہا اور پھر بغیر ٹکٹ لیے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ گاڑی سے اتر کر گھر جانے کی طرف بڑھنے لگا، مگر برسوں پہلے واقعے نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ ”بیٹا! اللہ تعالیٰ تو ہمیں دیکھ رہا ہے۔“ اس کے مرحوم دادا کے پندرہ برس پرانے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے اور وہ منظر بھی اس کی نگاہوں میں گھوم گیا جب مرحوم دادا نے اس وقت انوکھے حق دار کو اس کا حق پہنچایا تھا۔

”ہاں دادا! اللہ تعالیٰ ہر جگہ ہر وقت مجھے دیکھ رہا ہے۔“ وہ اپنے من سے کہنے لگا اور پھر اس کے قدم اپنے مرحوم دادا کے نقش قدم پر عمل پیرا ہونے کے لیے اٹھتے چلے گئے۔ ☆☆☆





ایسہ بتول

علیٰ فضلہ اور عائشہ کے چھوٹے اور لاڈلے چاچو تھے۔ جب کبھی وہ آپس میں گڑیوں کا بیہ رچائیں تو چاچو کا فیصلہ ہی قابل بھروسہ ہوتا کہ ان میں سے کس کی گڑیا زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ ان کے چھوٹے موٹے جھگڑے بھی بابا اور چاچو ہی سلجھاتے۔ اس بڑے سے گھر کے دو حصے تھے جہاں ایک طرف اکمل علی اور دوسری طرف اجمل علی بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ درمیان میں مشترکہ لان تھا۔ محبتوں، خوشیوں اور سکون سے بھرا یہ خوب صورت گھرانہ بے حد خوب صورت تھا اور وہ چاروں بچیاں گھر کی رونق اور سب کی جان تھیں۔

”ارے فضلہ، تم کمرے میں بیٹھی ہو! دیکھو کتنی اچھی بارش ہو رہی ہے۔ آؤ کچھ کھیلیں۔“ لاریب نے کھڑکی کھولتے ہوئے کہا۔

”نہیں، میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ وہ منہ پھلا کر بولی۔

”کیا؟ تم بارش میں کھیلنے سے منع کر رہی ہو؟“ رودابہ کو شدید حیرت ہوئی کیوں کہ سب سے زیادہ فضلہ کو یہ موسم پسند تھا۔ ”ہاں،

کیوں کہ ماما نے مجھے میری سکول فرینڈز کے ساتھ پکنک پہ نہیں بھیجا اور میں ان سے ناراض ہوں۔ مجھے بہت غصہ آیا ہوا ہے۔“

اودے اودے بالوں میں سے چھم چھم برسی بارش کا موسم ان چاروں کا پسندیدہ تھا۔ وہ بچپن سے بارش کی دیوانی تھیں۔ اورنجر اینڈ لیمن، رنگا رنگا روز، ککلی، میری گوراؤنڈ اور ریڈی گوجیسے کتنے ہی خوب صورت کھیل تھے جو وہ مل کر کھیلتیں اور پورا گھر ان کی چہکار سے گونجتا رہتا۔ کبھی کبھی بابا بھی کھیل میں شامل ہوتے تو لطف دو بالا ہو جاتا۔ ادھر ان کی مائیں پکوڑے اور پکوانوں کی تیاری کرتیں اور ادھر وہ چاروں بارش کے چھپاکوں میں اٹھکیلیاں کر رہی ہوتیں۔ چھوٹے چاچو نے لان میں ان کے لیے خاص طور پر جھولا لگوا دیا تھا۔ جس پہ وہ آپس میں خوب تکرار کرتیں۔ ”پہلے میں لوں گی، میں بڑی ہوں،“ آخر چھوٹے چاچو کو خود ہی فیصلہ کرنا پڑتا۔ ”ایسا کرتے ہیں سب باری باری جھولا لیں۔ سب سے پہلے عائشہ، پھر لاریب، پھر رودابہ اور آخر میں فضلہ کیوں کہ وہ سب سے بڑی ہے۔ جب دوبارہ کھیلو گی تو فضلہ سے باری شروع ہوگی۔“ اس تجویز پہ وہ راضی ہو گئی تھیں۔

ان میں عمروں کا بہت زیادہ فرق نہیں تھا۔ فضلہ اور عائشہ دونوں بہنیں تھیں جو اس گھر کے سب سے بڑے بھائی اکمل علی کی اولاد تھیں جب کہ لاریب اور رودابہ جڑواں تھیں جن کے بابا اجمل



ماؤں کو تشویش ہونے لگی۔ ”بھابھی! بچیاں کدھر ہیں؟ نظر نہیں آ رہیں۔“ رودابہ کی ماما نے اپنی جلیٹھانی سے پوچھا۔

”صبح سے اپنے کمرے میں گھسی ہوئی ہیں۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔ عائشہ کو تو میں نے زبردستی بارش میں جانے سے روک لیا تھا کیوں کہ وہ بیمار تھی مگر آج رودابہ اور فضا بھی باہر نہیں نکلیں۔“

”چلیں بلائیں ان کو، میرا خیال ہے کمپیوٹر سے چپکی ہوں گی۔“ چھوٹی چچی کا اندازہ بالکل درست تھا۔ انہوں نے کمرے میں جا کر دیکھا تو دونوں کسی بات پہ کھلکھلا رہی تھیں۔ کمپیوٹر کی سکرین روشن تھی۔ رودابہ نے جونہی ماما کو دیکھا فوراً سنبھل گئی۔ فضا کمپیوٹر بند کرنے لگی۔

کتنی بُری بات ہے لڑکیو! تم غالباً چار گھنٹوں سے کمپیوٹر پہ لگی ہوئی ہو۔“ چچی نے دونوں کو ڈانٹا۔

”سوری ماما.....“ ”سوری چچی!“ دونوں ایک ساتھ بولیں۔

”بیٹا! سوری کی بات تو ہے نہیں، بات اصول کی ہے۔ اتنی دیر فضول کاموں کے لیے کمپیوٹر استعمال کرنا مناسب نہیں۔ خصوصاً بچیوں کو ہر کام سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔“ وہ نرمی سے بولیں۔

”چلیں! اب آپ دونوں کے بابا آتے ہوں گے اور ہاتھ منہ دھو کر کھانے کے لیے آجائیں بلکہ سلا دتم دونوں مل کر بناؤ گی۔“ فضا اور رودابہ نے ایک دوسرے کو دیکھا اور سر ہلا دیا۔

”ویسے یار رودابہ، یہ موبائل بھی بڑی زبردست چیز ہے۔ انٹرنیٹ کی طرح، تفریح ہی تفریح.....“ فضا کھلکھلائی۔ آٹھویں کے شان دار رزلٹ پہ اس نے بابا سے ضد کر کے موبائل لیا تھا۔ وہ بالکل اس حق میں نہیں تھے کیوں کہ ابھی موبائل دینا اتنا ضروری نہیں تھا۔ بدلے میں انہوں نے کہا کہ وہ کوئی بھی تحفہ لے سکتی ہے۔ جتنے جی چاہے کپڑے جوتے لے لے مگر فضا موبائل پہ ہی اڑی ہوئی تھی۔ اس نے بھوک ہڑتال کر دی تو مجبوراً بابا کو بات ماننی پڑی اور اگلے ہی دن نفیس سا موبائل سیٹ اس کے ہاتھ میں تھا، صرف اس شرط پر کہ اس کی پڑھائی میں خلل نہ آنے پائے۔ اب اپنا پسندیدہ تحفہ لے کر وہ اتراتی پھرتی تو لاریب اور رودابہ بھی اس چیز کی خواہش ظاہر کرنے کے لیے پرتو لنے لگیں۔

”اچھا میں سمجھ گئی۔ تائی جان نے تمہیں اس لیے نہیں بھیجا کیوں کہ وہ سب اکیلی جا رہی ہوں گی۔ یہی نا؟“ لاریب نے بڑی بی بننے ہوئے رائے دی۔

”اکیلی تو خیر نہ کہو۔ ہم چھ فرینڈز کا گروپ جا رہا تھا۔ مونا کے ڈرائیور کے ساتھ۔ ماما نے منع کر دیا۔“ فضا اداسی سے بولی۔ ”فضا میری ماما بھی یہی کرتی ہیں..... باقی لڑکیوں کے والدین تو ایسی پابندی نہیں لگاتے۔ ماما کی سوچ بھی تائی جان جیسی ہے۔ وہ بھی عجیب لیکچر دیتی ہیں۔ تم بات کو نہیں سمجھتی، باہر عجیب لوگ ہوتے ہیں..... اگر کوئی بڑا ساتھ ہو تو جاؤ لیکن تنہا بچیاں نہیں۔“

”لو بھلا یہ کیا بات ہوئی!! ہم اتنی چھوٹی بھی نہیں ہیں..... تم چودہ سال کی ہو گئی ہو اور میں تیرہ کی۔ ہمارا بھی تو دل کرتا ہے کبھی کبھار فیملی کے علاوہ دوستوں کے ساتھ بھی نکلا کریں اور یہ مائیں ابھی تک ہمیں بچہ ہی سمجھتی ہیں۔“ رودابہ نے دل کی ساری بھڑاس نکال دی۔

”اور کیا، بابا سے پوچھوں تو وہ فوراً کہتے ہیں جہاں بھی جانا ہے، میں لے جاتا ہوں۔“ فضا نے ہم خیال ہو کر کہا۔

اچھا! چھوڑو، یہ بتاؤ عائشہ کہاں ہے؟“

”بخار ہے اسے۔ ماما نے سلا دیا ہے۔“ فضا نے بتایا۔

”اوہ..... لاریب نانوں کے ہاں گئی ہے اور تمہارا کھیلنے کا موڈ نہیں ہے..... مطلب آج کا دن بہت بور!!“ رودابہ کا منہ لٹک گیا۔ بارش کی رم جھم اب ہلکی ہو گئی تھی۔ ”اچھا چلو، یوں کرتے ہیں کمپیوٹر پر گیمز کھیلتے ہیں۔“ فضا نے اس کی خفا شکل دیکھ کر تجویز دی۔

”تمہیں انٹرنیٹ آتا ہے؟“ رودابہ کی آنکھوں میں ایک دم چمک آ گئی۔

”تھوڑا بہت..... بابا جب اپنے لیپ ٹاپ میں استعمال کرتے ہیں تو وہیں سے میں نے بھی سیکھا لیکن ہم انٹرنیٹ پہ کیا کریں گے؟“ وہ معصومیت سے پوچھنے لگی۔

”میری ایک کلاس فیلو نے کچھ ویب سائٹس بتائی تھیں۔ چلو، وہ سرچ کرتے ہیں اور سنا ہے چیٹنگ میں بھی بڑا مزا آتا ہے۔“

پھر وہ دونوں کمپیوٹر میں مصروف ہو گئیں۔ پوری دوپہر گزر گئی





”ہاں واقعی تمہاری زندگی میں کتنا لطف ہے نا..... میرے بابا تو کہتے ہیں کہ ابھی موبائل کا نام مت لو۔“ رودابہ نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ”تو میرے بابا کہاں راضی تھے! وہ تو اب بھی کہتے ہیں اسے ایک طرف رکھو اور پڑھائی پہ توجہ دو لیکن میری پیاری دوست، تم فکر مت کرو۔ جب چاہو اسے استعمال کر سکتی ہو بلکہ فارغ وقت میں ہم دونوں اس سے خوب شغل کریں گے۔“ فضلہ نے بڑے پیار سے رودابہ کو پیش کش کی۔ لاریب ذرا پڑھا کو قسم کی تھی اور عائشہ سب سے چھوٹی، سواب وہ ان دونوں کو اپنے تفریحی پروگراموں میں بہت کم شرکت کرتی تھیں۔ پہلے وہ چاروں اکٹھے کھیلتیں اور پڑھتیں مگر جب سے مشاغل بدلے تھے گھر کے بڑے ان میں ناگوار

”یہ تو واقعی مسئلہ ہے۔ اچھا یوں کرتے ہیں اگر اب دوبارہ کال آئی تو ہم اسے ڈانٹ دیں گے۔ سختی سے منع کریں گے کہ یہاں دوبارہ کال نہ کرے۔“ رودابہ کی بات سے فضلہ کچھ مطمئن ہو گئی اور پھر انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اسی نمبر سے دوبارہ کال آئی تو پہلے فضلہ نے خوب کھری کھری سنائیں اور پھر رودابہ نے کوٹہ پورا کیا۔ جواب میں کھی کھی کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ آپ کس کلاس میں پڑھتی ہیں؟“ دوسری طرف کچھ اثر نہ ہوا تھا بلکہ اس غیر متوقع جرأت پہ فضلہ حیران ہو گئی۔ ”آپ، آپ کون؟“ اسی طرح یہ گفتگو کچھ طویل ہو گئی۔ جب کال ختم ہوئی تو فضلہ کے چہرے پہ حقیقی ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”کاش میں موبائل لیتی ہی نہ.....“ وہ تاسف سے سوچنے لگی۔ اب مسڈ کالز کے ساتھ پیغامات بھی آنے لگے۔ آنے والے دنوں میں وہ عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئی۔ کبھی کبھی اسے شرمندگی ہوتی کہ وہ اپنے ماں باپ سے یہ قصہ چھپا کر بہت غلط کر رہی ہے۔ کہیں نہ کہیں اس سے کچھ غلط ضرور ہو رہا ہے۔ مسڈ کالز آنے میں بے شک اس کا قصور نہیں تھا لیکن بلا

تبدیلیاں اور نا اتفاقی محسوس کر رہے تھے۔ اب کئی دنوں سے عائشہ کے مجبور کرنے پر بھی فضلہ بیڈمنٹن کھیلنے کے لیے رضامند نہ ہوئی۔ تم جاؤ نا! میں نے کھیلنا ہوا تو آ جاؤں گی۔“ پلیز! فضلہ مل کر کھیلتے ہیں۔ ادھر رودابہ نخرے دکھاتی ہے اور ادھر تم۔ پتا نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے دونوں کو۔“ لاریب کو غصہ آنے لگا۔ ”یہ کیا بچوں والے کھیل کھیلتے ہو تم۔ بھی اب تو ہمارے پاس کمپیوٹر ہے، موبائل ہے۔ اب ان فضول کھیلوں میں میرا دل نہیں لگتا۔“ فضلہ نے موبائل پہ انگلیاں چلاتے ہوئے جواب دیا جب کہ لاریب اور عائشہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔ ”رودابہ میں بہت پریشان ہوں۔ ایک انجانا نمبر کافی دنوں سے تنگ کر رہا ہے۔ میں نے بس ایک دفعہ کال اٹینڈ کی تھی اور پھر اس کے بعد دن میں کئی مرتبہ ڈمب کالز آتی رہتی ہیں۔“ فضلہ نے آہستگی سے رودابہ کو کہا۔

”اوہ، تم فوراً اپنے بابا کو بتاؤ۔“

”کوئی آسان مشورہ دو۔ بابا کو کیسے بتاؤں؟ مجھے ڈر لگتا ہے

اگر انہوں نے موبائل لے لیا تو.....“



مقصد اجنبیوں سے فون پر گفتگو کرنا ہرگز اچھی بات نہیں۔ رودابہ اس کی بہترین دوست اور کزن تھی مگر وہ بھی اسی کی طرح بچی ہی تھی۔ اکثر اٹے سیدھے مشورے دیتی رہتی۔ فضلہ کا زیادہ تر دھیان اب موبائل کی طرف رہنے لگا تھا۔ پورے گھر کو حیرت کا جھٹکا تب لگا جب سکول کے امتحانوں میں فضلہ اور رودابہ دونوں کے گریڈ پہلے سے کافی کم آئے۔ اب ان پہ سختی شروع ہو گئی۔ پڑھائی کے لیے ٹیوٹر بھی رکھوا دیا۔ بابا کو ساری گڑبڑ موبائل میں ہی نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے موبائل واپس لینا چاہا تو فضلہ نے وعدہ کیا کہ آئندہ اس کا رزلٹ کبھی خراب نہیں ہوگا۔ وہ خاموش ہو گئے۔ جب بچے کوئی نادانی کرتے ہیں تو ماں باپ بن بتائے بھی سمجھ جاتے ہیں۔ اس روز دفتر سے واپسی پہ چاچو ڈھیر ساری آئس کریم لائے اور بچوں کو سر پرانز دینے کے لیے ان کے کمرے کی طرف آئے ہی تھے جب اندر سے آتی لاریب، رودابہ اور فضلہ کی آوازوں نے انہیں چونکا دیا۔ گفتگو کے ایسے انداز انہوں نے کبھی بچیوں کو نہیں سکھائے تھے۔ بہت جلد وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے۔ یہ صرف بیٹیوں کی تربیت کا مرحلہ نہیں تھا بلکہ پوری نسل کی بات تھی۔ اکمل علی اور اجمل علی کے لیے تو ان کی بچیاں نازک تتلیاں ہی تھیں جو گھر کے باغوں میں کھیلتی اچھی لگتی ہیں۔ ان معصوم بچیوں کو کیا پتا کہ باہر کی فضا کیسی ہوتی ہے، انہوں نے اپنے بڑے بھائی کو پوری بات بتائی تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔ پھر انہوں نے تحمل مزاجی سے کام لیتے ہوئے انہیں سمجھانے کا فیصلہ کر لیا۔

ڈرائنگ روم میں چاروں بچیاں اور ان کے والدین بیٹھے ہوئے تھے۔ بابا اور چاچو کے چہروں پہ گہری خاموشی تھی۔ فضلہ، اپنا موبائل لے آؤ۔“ بابا نے حکم دیا۔

فضلہ چپ چاپ اپنے کمرے سے موبائل اٹھا لائی اور بابا کے حوالے کر دیا۔ وہ منتظر تھی کہ اب نجانے کون سا فیصلہ سنایا جائے گا۔ بابا نے موبائل کی سم نکال کر میز پر رکھ دی۔

”تم لوگوں نے تتلیوں کو دیکھا ہے نا، کیسی ہوتی ہیں وہ؟“ انہوں نے عجیب سا سوال کیا۔

”بہت خوب صورت، پیاری سی۔“ چاروں بولیں۔

تتلی جتنی پیاری ہوتی ہے اتنی ہی نازک بھی ہوتی ہے۔ اس کے پر بہت نازک ہوتے ہیں۔ وہ بھی بہت اوپر اوپر اڑنا چاہتی ہے لیکن اسے پتا ہے کہ اگر وہ اپنی بساط سے زیادہ اڑی تو اسے نقصان ہوگا۔ اسی طرح تم چاروں بھی تو ہماری نازک سی تتلیاں ہو۔ بچیاں معصوم ہوتی ہیں۔ ان کی سب سے محفوظ پناہ گاہ گھر ہوتی ہے۔ جب وہ اپنے ماں باپ کی بات مانتی ہیں تو ہمیشہ فائدے میں رہتی ہیں۔ سہولیات دینے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کا صحیح استعمال کیا جائے۔ موبائل، کمپیوٹر، انٹرنیٹ آج کے دور میں بلاشبہ اہم ہیں لیکن ان کو مفید طریقے سے ہی کام میں لانا چاہیے ورنہ یہی سہولیات اخلاقی بگاڑ کا سبب بن سکتی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ باہر کے لوگوں میں خیر خواہ کوئی نہیں ہوتا۔ بچیوں کو اپنا ہر مسئلہ والدین سے کہنا چاہیے۔ انہیں اعتماد میں لینا چاہیے۔“ بابا کا اتنا کہنا کافی تھا۔ فضلہ اور رودابہ کے سر جھکے ہوئے تھے۔

”ہم تو اپنی تتلیوں کے لیے اداس ہو گئے تھے۔ کافی دنوں سے لان بھی سونا سونا لگ رہا تھا۔ کیا اب آپ لوگوں کو بارش پسند نہیں؟“ چاچو ہنس کر بولے۔

”پسند ہے۔ سوری بابا! ہم کبھی ایسی غلطی نہیں کریں گے۔“

”بالکل! اور اسی طرح آپس میں پیار محبت سے رہنا ہے۔“

”بابا میں موبائل استعمال نہیں کروں گی کیوں کہ ابھی مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ آپ واپس لے لیں۔“ فضلہ کو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔

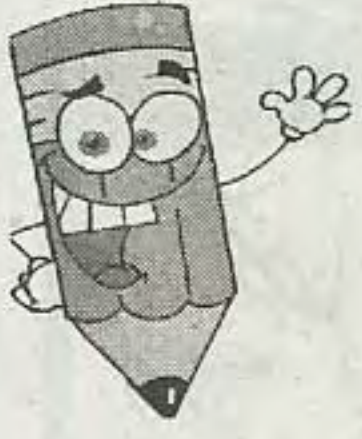
”ویسے دل بہلانے کے لیے تم خالی سیٹ رکھ سکتی ہو۔“ چاچو نے چڑاتے ہوئے کہا تو سب لوگ ہنس پڑے۔

پیاری تتلیو! آپ بھی ہنستی مسکراتی اور خوشیاں بکھیرتی اچھی لگتی

ہیں۔ آپ کا ہر قدم صاف ستھرا اور مضبوط ہونا چاہیے تاکہ آپ قابل فخر بیٹیاں بنیں۔ کوئی بھی چیز بذات خود بُری یا اچھی نہیں ہوتی، بلکہ انسان کا اختیار اسے کچھ بھی بنا سکتا ہے۔ اگر آپ موبائل استعمال کرتی ہیں تو خوب محتاط رہیے کیوں کہ بعض اوقات رنگ کالز سے بچیاں بہت سی غلطیاں کر جاتی ہیں۔

☆.....☆.....☆





# سوال یہ ہے کہ.....!

انعامی سلسلہ

- ۱۔ اَلْبَصِيرُ کے کیا معنی ہیں؟
- ۲۔ شالامار باغ میں نصب فواروں کی تعداد کتنی ہے؟
- ۳۔ کس سائنسی رسالے نے قرارداد پاکستان کی حمایت میں لکھا؟
- ۴۔ جو جسٹو کھیل کے بانی کا کیا نام تھا؟
- ۵۔ ڈائنوسار کے کیا معنی ہیں؟
- ۶۔ پاکستان نے ایٹمی دھماکہ کب کیا؟

درج بالا سوالوں کے جوابات مارچ 2014ء کے شمارے میں موجود ہیں۔ آپ رسالہ غور سے پڑھیے اور اپنے جوابات لکھ بھیجئے۔ درست جواب دینے والے تین خوش نصیبوں کو 300 روپے کی انعامی کتب دی جائیں گی۔ تین سے زیادہ درست حل آنے کی صورت میں بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جائیں گے۔

فروری 2014ء میں بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کے نام:

3- انصر علی، وہاڑی

2- غاصیقہ صابر، لاہور

1- حافظہ مہدیہ آصف، گوجرانوالہ

## آئیے عہد کریں

کوپن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 مارچ 2014ء ہے۔

نام \_\_\_\_\_ مقام \_\_\_\_\_  
میں عہد کرتا کرتی ہوں کہ \_\_\_\_\_  
موبائل نمبر: \_\_\_\_\_

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 مارچ 2014ء ہے۔

کھوج

لگائیے

مکمل پتا:

نام: \_\_\_\_\_  
شہر: \_\_\_\_\_  
مکمل پتا: \_\_\_\_\_  
موبائل نمبر: \_\_\_\_\_

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 مارچ 2014ء ہے۔

نام:

مقام:

دماغ لڑاؤ

مکمل پتا:

نام \_\_\_\_\_ مقام \_\_\_\_\_  
مکمل پتا: \_\_\_\_\_  
موبائل نمبر: \_\_\_\_\_

کوپن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 مارچ 2014ء ہے۔

## سوال یہ ہے کہ.....!

نام:

مکمل پتا:

نام \_\_\_\_\_ عمر \_\_\_\_\_  
مکمل پتا: \_\_\_\_\_  
موبائل نمبر: \_\_\_\_\_

## میری زندگی کے مقاصد

کوپن پر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام \_\_\_\_\_ شہر \_\_\_\_\_  
مقاصد \_\_\_\_\_  
موبائل نمبر: \_\_\_\_\_

فروری کا موضوع وادی کشمیر ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 مارچ 2014ء ہے۔

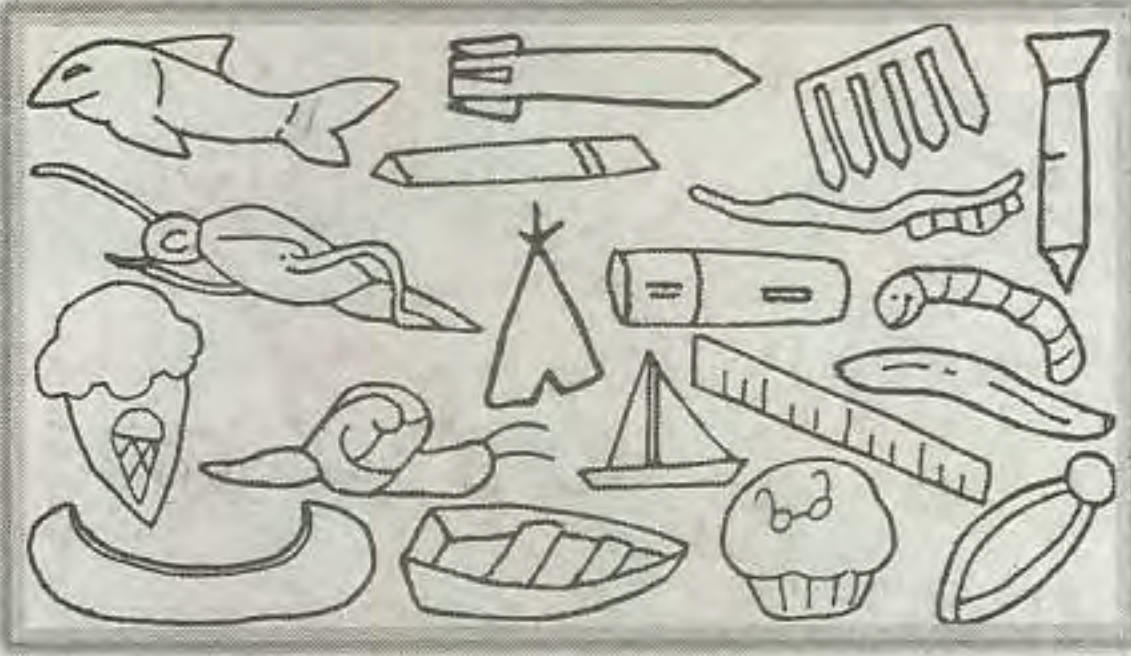
## ہونہار مصور

نام:

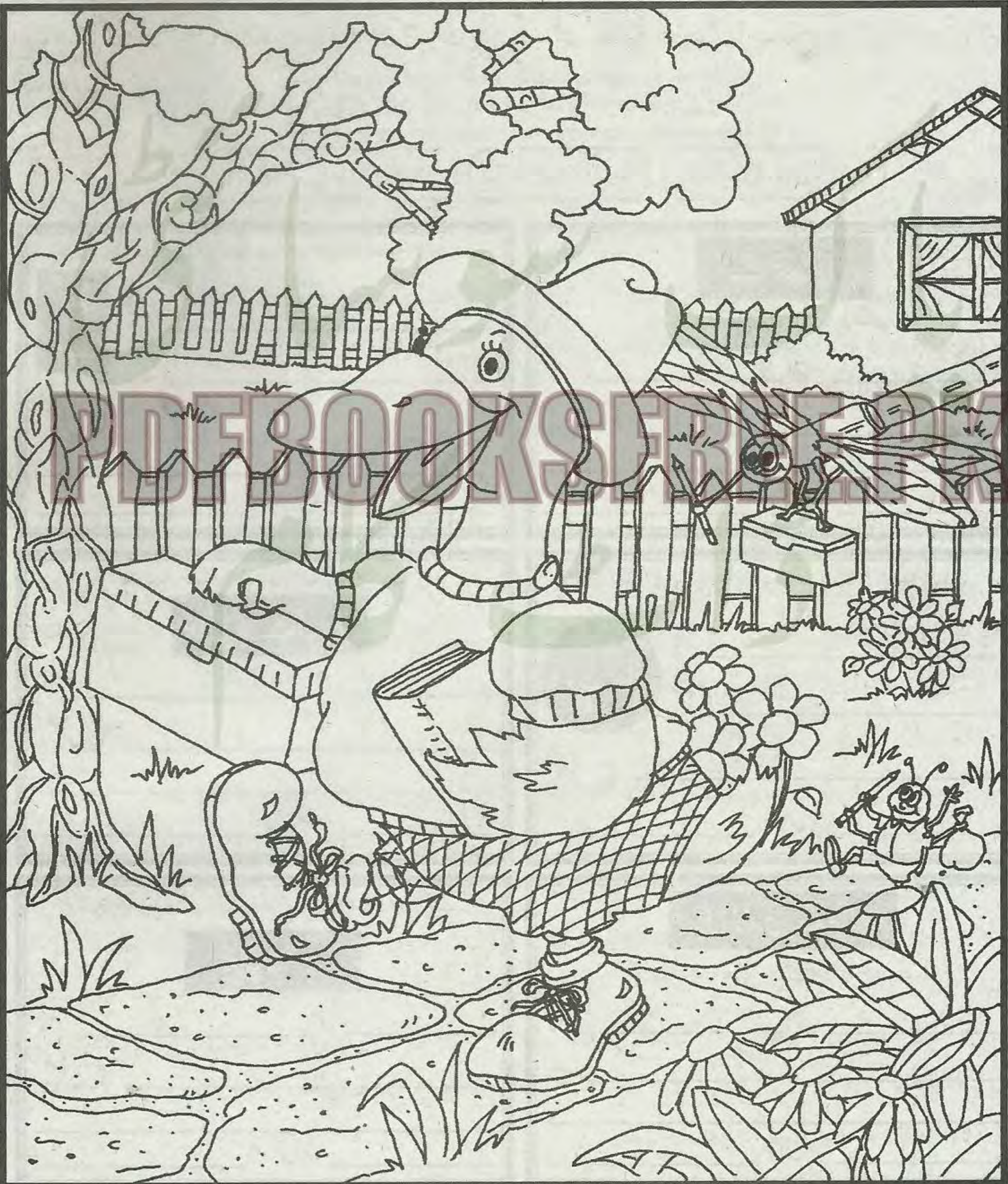
مکمل پتا:

نام \_\_\_\_\_ عمر \_\_\_\_\_  
مکمل پتا: \_\_\_\_\_  
موبائل نمبر: \_\_\_\_\_





یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجئے اور شاباش لیجئے۔





# مہر و پیا



خلیل جبار

میرے اس طرح ڈانٹنے پر نیا مریض سہم جاتا ہے جب کہ پرانے مریض میرے پاس آنے سے پہلے ڈانٹ سے بچنے کے لیے اچھی طرح منہ صاف کر کے آتے ہیں لیکن ان کے منہ کی بھبک سے صاف پتا چل جاتا ہے کہ میرے منع کرنے کے باوجود گٹکا، چھالیہ اور پان کا استعمال نہیں چھوڑا ہے۔ میرے دل میں آیا کہ اس آدمی کو ڈانٹ دوں، لیکن اس کی بزرگی کا خیال کرتے ہوئے رُک گیا تھا۔

اس آدمی نے پیک تھوک کر اپنی گرج دار آواز میں کہا۔  
”تین سو روپے دے جا، ورنہ آج کا دن تجھ پر بڑا بھاری گزرے گا۔“

”کیا تین سو روپے دینے پر دن بھاری نہیں گزرے گا؟“  
میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”میری بات کو مذاق مت سمجھ، تو بہت پچھتائے گا۔“  
”میں مذاق نہیں سمجھ رہا، اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اگر میں

میں جیسے ہی بک اسٹال سے اخبار لے کر موٹر سائیکل کی جانب بڑھا، اچانک ایک موٹا سا آدمی میرے سامنے آکھڑا ہوا۔ اُس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ منہ میں گٹکا ٹھنسا ہوا تھا جس سے اُس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ پورے جسم پر تووند زیادہ نمایاں تھی۔ اُس نے میری طرف دیکھ کر کچھ کہا لیکن میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتا ہے۔

”بابا جی! پہلے منہ کو خالی کر لو تا کہ میری سمجھ میں آسکے کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔“ میں نے کہا۔

”میں پٹھے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہوں، میرے پاس جو مریض آتے ہیں ان میں زیادہ تر ایسے افراد کی تعداد زیادہ ہوتی ہے جو گٹکا، چھالیہ اور پان کھاتے ہیں۔ مجھے ایسے افراد سے شدید گھن آتی ہے اور میں ان کو سختی سے جھڑک دیتا ہوں۔“

”تم یہ زہریوں اپنے اندر اُگل رہے ہو، یہ تمہیں منہ اور گلے کے کینسر کا تحفہ دے گا، مت کھایا کرو یہ زہر۔“



تین سو روپے دے دوں تو پھر دن بھاری نہیں پڑے گا؟“ میں نے وضاحت کی۔

میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی اس لیے اس نے ہاں کرتے ہوئے گردن ہلائی تھی۔

”یار بحث نہیں کرو۔ جلدی سے بابا کو تین سو روپے دے دو۔“ ڈاکٹر نوید نے کہا۔

ڈاکٹر نوید میرے گھر کے نزدیک ہی رہتا تھا اس لیے ہم دونوں روزانہ اکٹھے ہی اسپتال جاتے تھے۔

”کیوں؟ کیا تمہیں تین سو روپے میں سے یہ بابا کمیشن دے گا۔“ میں نے ہنستے ہوئے اس کے کان میں کہا۔

”بات سمجھا کرو، تین سو روپے دے کر ہم کسی بڑی مصیبت سے بچ جائیں، یہ کیا اچھا نہیں ہے؟“ ڈاکٹر نوید نے مجھے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”اگر میں تین سو روپے نہ دوں تو پھر میرے ساتھ کیا ہو سکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت بُرا ہوگا، تم کسی گاڑی کے نیچے آ کر شدید زخمی ہو جاؤ گے۔“ اس نے کہا۔

”لگتا ہے آپ بہت ہی پہنچے ہوئے بزرگ ہیں اس لیے تین سو روپے لے کر میری مصیبت ٹال دیں گے۔“ میں نے کہا۔

”بابا جب آپ اتنے پہنچے ہوئے ہیں تو اپنی حالت کیوں نہیں سدھار لیتے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے منہ سے یہ جملہ نکل گیا۔

اس کی حالت ہی ایسی تھی کہ دیکھ کر ترس آ رہا تھا۔ خود کی حالت سدھار نہیں سکتا اور دُوسروں کو تین سو روپے لے کر حادثات سے بچا رہا ہے۔

”فضول میں تم وقت ضائع کر رہے ہو، تین سو روپے دے دینے سے تم کون سا کنگلے ہو جاؤ گے۔“ ڈاکٹر نوید نے کہا۔

دو چار آدمی وہاں کھڑے تھے، وہ بھی ڈاکٹر نوید کی بات سن کر مجھے سمجھانے لگے کہ میں حادثے سے بچنے کے لیے بابا کو پیسے دے دوں، لیکن میں کسی طور بھی اس بہروپیے کو پیسے دینے کو تیار نہ تھا۔ میں نے جیسے ہی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی، ڈاکٹر نوید نے میرے

ساتھ موٹر سائیکل پر جانے سے انکار کر دیا۔

”نہیں بھئی، میں تمہارے ساتھ آج اسپتال نہیں جاؤں گا۔“

”کیوں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”آج تمہارے ساتھ کسی بھی وقت حادثہ پیش آ سکتا ہے اور

جو بھی تمہارے ساتھ ہوگا، وہ بھی حادثے کا شکار ہو سکتا ہے۔“ ڈاکٹر نوید نے کہا۔

”اچھا! اس لیے تم میرے ساتھ جانا نہیں چاہتے جیسے تمہاری مرضی۔“ یہ کہتے ہوئے میں آگے بڑھ گیا۔

اس بہروپیے بابا جیسے لوگ ہر جگہ مل جاتے ہیں جن کا کام یہی ہے، لوگوں کو حالات خراب ہونے یا حادثہ ہونے کی اطلاع دے کر

رقم لے کر ان کے حالات سدھارنا یا حادثے سے بچانا ہوتا ہے۔ مجھے اکثر ایسے لوگ ملتے ہیں جو اس جیسے بہروپیوں کے چکر میں آ

جاتے ہیں اور افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کاش ہم بابا کو پیسے دے دیتے تو شاید اس آئی ہوئی پریشانی سے بچ جاتے۔ ڈاکٹر نوید

کا پریشان ہو جانا میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس کی مثال ایسی ہی تھی کہ دودھ کا جلا چھا چھ بھی پھونک کر پیتا ہے۔ ابھی دو روز

پہلے ہی کی تو بات ہے۔ ڈاکٹر نوید اپنی فیملی کے ساتھ حیدرآباد میں ایک شادی کی تقریب میں شرکت کر کے کار میں کراچی آ رہے تھے

کہ ان کی کار مخالف سمت سے آتی ہوئی کار سے ٹکرائی اور ان کی کار الٹ گئی۔ کار کے الٹنے سے ڈاکٹر نوید اور اس کے بیوی بچے

معمولی سے زخمی ہو گئے۔ میری ملاقات ہونے پر وہ بڑے افسردہ لہجے میں بولا۔

”کاش میں اس بابا کو پیسے دے دیتا تو یہ حادثہ پیش نہ آتا۔“

”کیا اس بابا کو کوئی جادو منتر آتا ہے جو تمہیں اس حادثے

سے بچا لیتا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تم ہر بات کو مذاق میں لے جاتے ہو۔ بھئی، یہ بہت پہنچے

ہوئے بزرگ ہیں۔ وہ جتنے پیسوں کا تقاضا کریں فوراً دے دینے چاہیے ورنہ انسان کو وہی حادثہ ہو کر رہتا ہے جیسے ہمیں ہوا ہے۔

کاش میں اس فقیر کو پیسے دے دیتا۔“ ڈاکٹر نوید نے کہا۔

”ویسے یار یہ سودا بہت سستا ہے۔ انسان حادثے میں زخمی ہو



کے پاس ہی کھڑا تھا۔  
”لو بابا! تین سو روپے۔“ میں نے تین سو روپے اس کی طرف بڑھائے۔

”میں یہ تین سو روپے نہیں لوں گا۔“ بابا نے جلال میں آتے ہوئے کہا۔

”رکھ لیں! یہ اصلی نوٹ ہیں، جعلی نہیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔  
”میں نے جس وقت تم سے تین سو روپے مانگے تھے اُس وقت تم دے دیتے تو میں لے لیتا، لیکن جانے کے بعد واپس آئے ہو، اس لیے اب تین سو روپے کے بجائے تین ہزار روپے لوں گا۔ اس سے ایک روپیہ بھی کم نہیں لوں گا۔“ اس نے غصے سے کہا۔  
”تین سو روپے کی رقم تین ہزار میں کیسے تبدیل ہو گئی۔“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”وقت وقت کی بات ہے۔ اس وقت میں تین سو روپے لے

کر ڈاکٹروں کی فیس اور دوائیوں پر لاکھوں روپے خرچ کرے، اس سے کہیں بہتر ہے اس بابا کو تلاش کر کے پوچھنا چاہیے کہ بابا ہم پر کوئی پریشانی تو نہیں آرہی ہے۔ وہ ہاں کہیں تو دو، تین سو روپے دے کر لاکھوں روپے بچا لینے چاہئیں۔“ میں نے کہا۔

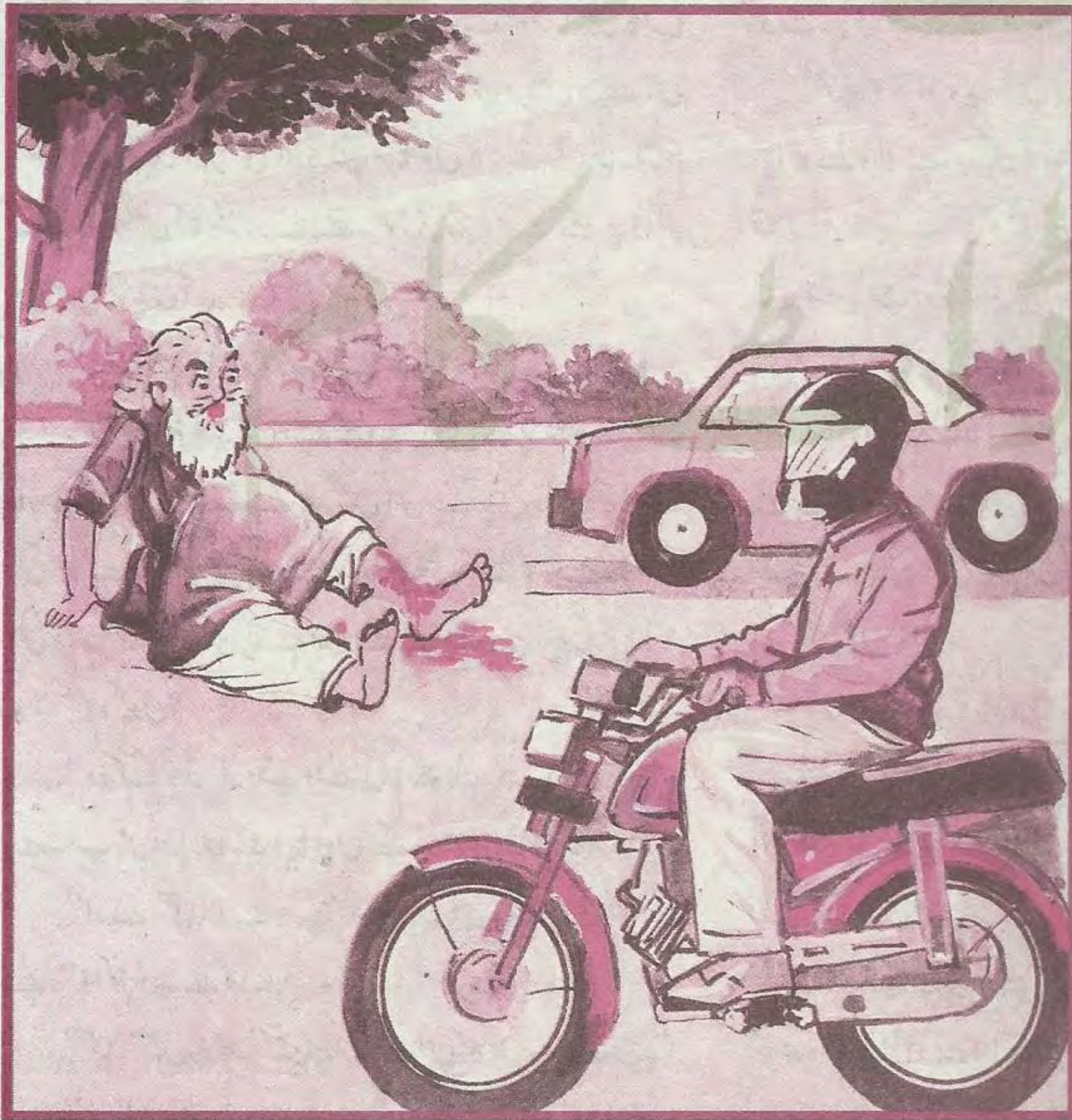
”ڈاکٹر سرور! تم نے پھر وہی بات کی، تم اس طرح کی باتوں کو مذاق میں کیوں لے جاتے ہو۔“

”یار میں کون سی غلط بات کر رہا ہوں۔ دیکھو، میں نے سنا ہے کہ صدقہ آنے والے حادثے یا مشکل کو ٹال دیتا ہے۔ کسی غریب کو مدد کی غرض سے اُسے صدقہ و خیرات دینا اچھی بات ہے، لیکن یہ میں نے کہیں نہیں سنا کہ کوئی انسان پیسے لے کر حادثات سے بچا لے گا۔ کم از کم میری عقل اس معاملے میں کام نہیں کرتی۔“ میں نے کہا۔

میری اس بات پر ڈاکٹر نوید خاموش ہو گیا تھا۔ اس طرح

کے کئی واقعات اور لوگوں کے ساتھ بھی ہو چکے تھے اور میں نے انہیں یہ سمجھانے کی بھرپور کوشش کی تھی کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ محض اتفاق ہے لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

کچھ دُور جانے پر اچانک مجھے خیال آیا کہ میں نے تین سو روپے کسی غریب کی مدد کرنے کی غرض سے رکھے تھے۔ سوچا اس بابا کو دے دوں، اس کی حالت بھی ایسی ہی تھی کہ اس کی مدد کی جائے۔ یہ سوچ کر میں پلٹ آیا، وہ بابا ابھی تک بک اسٹال





ہے۔ تم اب احتیاط کرو، پورے ہفتے کوشش کرو گھر میں ہی رہو۔  
 اسپتال سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لو۔“ ڈاکٹر نوید نے کہا۔  
 ”اچھا چھوڑو ان فضول باتوں کو میں گھر جا رہا ہوں، میرے  
 ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

”نا بابا نا! اس ہفتے میں تمہارے ساتھ قطعی گھر نہیں جاؤں گا  
 اور نہ اسپتال آؤں گا۔“ ڈاکٹر نوید نے اپنا فیصلہ سنایا۔

”اوکے، جیسے تمہاری مرضی۔“ میں نے اپنے کندھے اچکائے۔  
 میں پورے ہفتے تک اکیلا ہی اسپتال آتا رہا اور جاتا رہا۔  
 ڈاکٹر نوید کو جب یقین ہو گیا کہ مجھے کوئی حادثہ پیش نہیں آیا ہے اور  
 نہ ہی امکان ہے تو وہ میرے ساتھ اسپتال جانے اور آنے پر تیار ہو  
 گیا۔ اگلے دن ہم دونوں موٹر سائیکل پر سوار اسپتال جا رہے تھے  
 کہ راستے میں ہم نے دیکھا کہ ایک ٹرک کے نیچے ایک شخص آ کر  
 شدید زخمی ہو گیا تھا۔ قریب جا کر دیکھنے پر ہم دونوں بُری طرح  
 چوٹیں کھائیں۔ زخمی ہونے والا اور نہیں وہی بہرہ ویا بابا تھا۔

”دیکھ لو ڈاکٹر نوید! جس کو اپنا ہوش نہیں ہے کہ اس کے ساتھ  
 کیا ہونے والا ہے، وہ کسی کو کیا بچائے گا۔ اس بہرہ ویا بابا نے کہا  
 تھا کہ اگر میں نے اس کو تین ہزار روپے نہ دیئے تو میرا ٹرک کے  
 ساتھ ایکسیڈنٹ ہو گا لیکن پورا ہفتہ گزر گیا میرا تو ایکسیڈنٹ نہیں ہوا  
 بلکہ اس کا ایکسیڈنٹ ٹرک سے ضرور ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا۔

میری اس بات کا ڈاکٹر نوید کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ  
 بڑی حیرت سے اس بہرہ ویا کو دیکھ رہا تھا جس کی ایکسیڈنٹ میں  
 ایک ٹانگ بُری طرح کچلی گئی تھی اور ہڈیاں گوشت پھاڑتی ہوئی  
 باہر آ چکی تھیں۔

”ڈاکٹر نوید یہ تو بہرہ ویا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں عقل و  
 شعور دیا ہے۔ ہمارا ایمان اور عقیدہ اتنا کمزور نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی  
 بھی بہرہ ویا ہمیں آسانی سے بے وقوف بنا ڈالے۔“ میں نے  
 اُسے سمجھانے کی غرض سے کہا۔

ڈاکٹر نوید میری بات کا جواب دینے کے بجائے شرمندہ  
 شرمندہ سا دکھائی دے رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

لیتا، لیکن اب ریٹ بڑھ چکا ہے، اس لیے تم اگر حادثے سے بچنا  
 چاہتے ہو تو فوراً تین ہزار روپے دے دو۔“ بابا نے کہا۔  
 ”میں اس وقت تین سو روپے دے سکتا ہوں، اس سے زیادہ  
 نہیں۔“ میں نے کہا۔

”سوچ لے اب اگر جا کر دوبارہ آیا تو چھ ہزار روپے لوں گا۔“  
 ”بابا اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ میں کسی ڈر یا خوف کے تحت  
 آیا ہوں، میں تمہاری یہ حالت دیکھ کر مدد کرنے کی نیت سے آیا ہوں۔  
 یہ رقم لے رہے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ خدا حافظ۔“ میں بھی غصے میں آ گیا۔  
 ”جا..... جا! حادثہ تیرے سر پر منڈلا رہا ہے۔ تیرا ٹرک سے  
 اتنا زبردست ایکسیڈنٹ ہو گا کہ تو چھ ماہ سے پہلے بستر پر سے نہیں  
 اٹھ سکے گا۔“ بابا جلال میں آتے ہوئے بولا۔

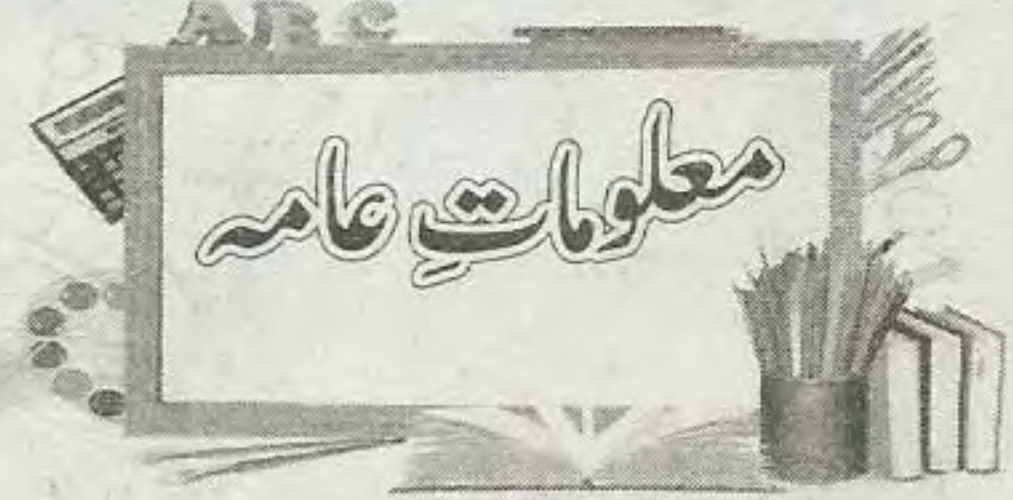
”ٹھیک ہے بابا! تمہاری مرضی، میں کل اسی مقام پر آ کر تم  
 سے ملاقات کر کے بتاؤں گا کہ دیکھو تمہاری بددعا کے باوجود میں  
 بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے موٹر سائیکل کا رخ  
 سول اسپتال کی طرف کر دیا۔ اسپتال پہنچ کر میں مریض دیکھنے میں  
 مصروف ہو گیا۔ ایمرجنسی وارڈ میں مریضوں کا بہت رش تھا۔ شام  
 گئے تک مریض آنا بند ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر فرصت ملنے پر ڈاکٹر  
 نوید میرے پاس آیا۔

”آپ اس بابا کو رقم دے دیتے تو کیا ہو جاتا۔“  
 ”دیکھو ڈاکٹر نوید میں ایسے بہرہ ویا کی بات پر یقین نہیں کرتا  
 اور ہاں تمہارے جانے کے بعد میں اس کے پاس دوبارہ گیا تھا۔  
 اس ڈر سے نہیں کہ پیسے نہ دینے پر حادثہ پیش آئے گا بلکہ میرا مقصد  
 اس کی مدد کرنا تھا، لیکن پتا ہے اس نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔“  
 ”وہ کیوں؟“

”وہ کہہ رہا تھا کہ وقت وقت کی بات ہے، اب ریٹ بڑھ گیا  
 ہے۔ اب تین ہزار روپے دینا ہوں گے۔“ میں نے بتایا۔  
 ”ارے بھئی، دے دیتے تمہارے پاس پیسوں کی کیا کمی  
 ہے۔“ ڈاکٹر نوید نے کہا۔

”کیا؟“ میں چونکا۔ ”تین ہزار روپے اس بہرہ ویا کو دے دیتا۔“  
 ”ہاں! اس طرح حادثے سے تو محفوظ رہو گے۔“ میرا مشورہ





## معلومات عامہ

- حضرت مجدد الف ثانی کا اصل نام شیخ احمد سرہندی ہے۔
- مشہور بزرگ حضرت میاں میر کا اصل نام شیخ محمد ہے۔
- حضرت نظام الدین اولیاء کو سلطان المشائخ کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔
- حضرت بابا بلھے شاہ کا اصل نام حضرت عبداللہ شاہ ہے۔
- شیخ السلام کا لقب برصغیر کے بادشاہ قطب الدین ایبک نے سید کبیر قطب الدین محمد المدنی حسنی کو دیا تھا۔
- سید سعید الدین جہانیاں جہاں گشت کا خاندانی نام ہے۔
- حضرت بابا بلھے شاہ غوث اعظم کی اولاد میں سے تھے۔
- خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی نماز جنازہ برصغیر کے حکم ران سلطان اتمش نے پڑھائی۔ (صغریٰ نعیم، لاہور)
- سفید تھوٹھا رنگ سلفیٹ کو کہا جاتا ہے۔
- برف صفر درجہ پر پگھلنا شروع ہو جاتی ہے۔
- باکسائیٹ سے المونیم دھات حاصل کی جاتی ہے۔
- پارہ، سیسہ، پانی اور ہوا میں سے پارہ ان سب سے زیادہ بھاری ہوتا ہے۔
- آکسیجن یونانی زبان کا لفظ ہے۔
- ابو ریحان البیرونی نے اٹھارہ پتھروں کی بالکل صحیح کثافت معلوم کی تھی۔
- برقی مقناطیسی موجیں روشنی کی لہروں کی رفتار کے برابر ہوتی ہیں۔
- ایتھر کا استعمال سب سے پہلے ڈاکٹر کراؤ فورے نے کیا۔
- ویکيوم فلاسک تھرموس کو کہتے ہیں۔
- بجلی کا نام الیکٹریٹی ولیم گلبرٹ نے رکھا تھا۔
- بجلی کا سب سے اچھا موصل چاندی ہے۔
- ٹانک ایسڈ روشنائی بنانے میں استعمال ہوتا ہے۔ (نعمان احمد، سرگودھا)
- بابائے ریاضیات اقلیدس کو تسلیم کیا جاتا ہے۔
- اقلیدس، بطلموس اول کے عہد میں یونان میں پیدا ہوا۔
- عظیم ماہر فلکیات، جغرافیہ دان، ریاضی دان بطلموس کو اہل یورپ میں پوئل می کے نام سے پکارا جاتا ہے۔
- بطلموس کی سب سے مشہور کتاب المجستی ہے۔
- بطلموس کی کتاب جغرافیہ 8 جلدوں پر مشتمل ہے۔
- بابائے علم تشریح جالینوس کو کہا جاتا ہے۔
- جالینوس نے ایک خواب دیکھنے کے بعد طب کے علم کو بہ طور پیشہ اختیار کیا۔
- علم المناظر کا امام عظیم مسلمان سائنس دان ابن الہیثم کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ (فرخندہ لطیف، کراچی)
- بلوچی میں آزاد شاعری کے بانی عطاشاد ہیں۔
- بلوچی میں ساربانوں اور چرواہوں کے گیت کو لیکو کہتے ہیں۔
- بلوچی نثر کی ابتداء انگریز دور حکومت میں ہوئی۔
- بلوچی زبان کے اولین ناول نگار سید ظہور ہاشمی کے ناول کا نام نازک ہے۔
- بلوچی زبان میں نظم کے لیے شیر کا لفظ مستعمل رہا ہے۔
- مشہور بلوچی شاعر رحم علی نے گنبد نامی جنگ کے واقعات کو نظم کیا ہے۔
- برصغیر میں مسلمانوں کے لیے سب سے پہلے سرسید احمد خاں نے قوم کا لفظ استعمال کیا۔
- چوہدری رحمت علی نے لفظ "پاکستان" کو 1933ء میں وضع کیا۔
- 23 مارچ 1940ء کو قرار داد لاہور کو ہندو اخبارات نے قرار داد پاکستان کا نام دیا۔
- نواب سلیم اللہ کی تجویز پر تقسیم بنگال عمل میں آئی۔
- انگلستان میں چوہدری رحمت علی نے پاکستان نیشنل موومنٹ کی بنیاد رکھی۔ (رخسار زیدی، لاہور)





درزی: 300 روپے۔

حامد: اور نیکر کی؟

درزی: 100 روپے۔

حامد: نیکر سی دو، لمبائی پاؤں تک رکھنا۔ نماز بھی تو پڑھنی ہوتی ہے۔

☆.....

شاہد (حمید سے): یار چڑیلوں کے ناخن اتنے بڑے کیوں ہوتے ہیں۔  
حمید: بے وقوف ان کے پاس نیل کٹر جو نہیں ہوتا۔

(ردا عدیل، لاہور)

بچہ (امی سے): امی مجھے دس روپے دے دیں۔ میں نے ایک انسان کی مدد کرنی ہے۔

امی: کس کی مدد کرنی ہے؟

بچہ: گلی کے کونے پر کھڑے قلفی والے کی۔ (سوبا عدیل، لاہور)

ایک بے وقوف حیرانی سے چاند ستارے دیکھ رہا تھا۔ راہ گیر نے پوچھا: بھائی! اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟

بے وقوف: یہ ستارے اور چاند بڑے خوشی سے جگمگا رہے ہیں، جب بجلی کا بل آئے گا تو انہیں پتا چلے گا۔ (منیبہ عارف، ڈبکوٹ)

مریض (ڈاکٹر سے): مجھے بھولنے کی بیماری ہو گئی ہے، کوئی علاج بتائیں۔

ڈاکٹر: یہ بیماری کب شروع ہوئی؟

مریض: کون سی بیماری ڈاکٹر صاحب۔ (محمد ہاشم چیمہ، وزیر آباد)

لاپچی مہمان: بیٹا! میں کتنی دیر آپ کے والد کا انتظار کر رہا ہوں.....  
آخر وہ اندر کیا کر رہے ہیں؟

کنجوس میزبان کا بیٹا: آپ کے جانے کا انتظار۔

(محمد مبشر شاہ، کوہاٹ)

ماں (بیٹے سے): بیٹا، ہمیشہ سچ بولنا چاہیے۔

بیٹا (خوش ہو کر): امی! پھر آپ بتائیں، مٹھائی کا ڈبہ کہاں رکھا ہے۔

☆.....

ڈاکٹر (مریض سے): میں حیران ہو کہ تمہارے دل کی دھڑکن اچانک اتنی تیز کیوں ہو گئی ہے۔

مریض: میری آنکھوں نے ابھی ابھی آپ کی فیس کا بورڈ دیکھ لیا ہے۔

(شفق فاطمہ، راول پنڈی)

ڈاکٹر (مریض سے): کیا تکلیف ہے آپ کو؟

مریض: جناب مجھے دل کا ایک دورہ پڑ چکا ہے۔

ڈاکٹر: تو پھر آپ کسی اور ڈاکٹر کے پاس جائیں۔

مریض: وہ کیوں؟

ڈاکٹر: کیوں کہ میری فیس سن کر آپ کو دل کا دوسرا دورہ پڑ جائے گا۔ (زارا ادباب، اسلام آباد)

ایک عورت فوٹو سٹوڈیو میں داخل ہوئی۔

اس نے ایک تصویر کو دیکھ کر فوٹو گرافر سے پوچھا:

تم نے اتنی موٹی، کالی اور بوڑھی عورت کی تصویر کیوں کھینچی ہے؟

فوٹو گرافر نے کہا: معاف کیجئے گا، محترمہ جسے آپ تصویر سمجھ رہی ہیں وہ دراصل آئینہ ہے۔ (تسمینہ ادریس، کراچی)

استاد (شاگرد سے): کوئی ایسی مثال دو کہ گرمی میں چیزیں پھلتی ہیں اور سردیوں میں سکڑتی ہیں۔

شاگرد: جناب! گرمیوں میں چھٹیاں پھلتی پھلتی تین ماہ تک ہو جاتی ہیں۔ سردیوں میں سکڑتی سکڑتی دس دن بمشکل ہوتی ہیں۔

☆.....

ایک فقیر کو دو کھنکول لے کر بھیک مانگ رہا تھا۔

ایک آدمی نے کہا: پہلے تو تم ایک کھنکول لے کر آتے تھے۔ اب تم دو لے کر کیوں آتے ہو۔

فقیر نے کہا: مہنگائی کا دور ہے۔ میں نے سوچا کیوں نہ دوسری برانچ بھی کھول لوں۔ (صبح الحسن، سیال کوٹ)

حامد: پینٹ کی سلائی کتنی ہے؟



## میری زندگی کے مقاصد



ایم جواد، اسلام آباد  
میں فوج میں جا کر ملک و قوم کی  
خدمت کروں گا۔



باسط علی، کراچی  
میں بڑا ہو کر دین اسلام کی اشاعت  
کروں گا۔



محمد اسلم، پشاور  
میں انجینئر بن کر ملک کی ترقی میں اہم  
کردار ادا کروں گا۔



علیان جمیل، کراچی  
میں بڑا ہو کر اللہ اور اس کے رسول کی  
تعلیمات پر عمل کروں گا۔



سجیل زاہرہ، پشاور  
میں ڈاکٹر بن کر مریضوں کا مفت  
علاج کروں گی۔



محمد حمزہ متین، لاہور  
میں فوجی بن کر ملک و قوم کی خدمت  
کروں گا۔



سیدہ زویا احمد، گوجرانوالہ  
میں ٹیچر بن کر علم کی روشنی پھیلاؤں  
گی۔



صدام حسین، مالاکنڈ کوٹ  
میں فوج میں جاؤں گا اور ملک و قوم  
کی خدمت کروں گا۔



سعدیہ انصاری، حیدرآباد  
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت  
کروں گی۔



ولید احمد، گوجرانوالہ  
میں باکسر بننا چاہتا ہوں تاکہ ملک کا  
نام روشن کروں۔



محمد حمزہ شاہ، کراچی  
میں انسانیت کی خدمت کو اپنی زندگی  
کا محور بناؤں گا۔



محمد اویس احمد، ملتان  
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کی ترقی  
میں اہم کردار ادا کروں گا۔



ایمان عقیل، کراچی  
میں ڈاکٹر بن کر غربیوں کا مفت علاج  
کروں گی۔



محمد احمد خان غوری، بہاول پور  
میں آرمی آفیسر بن کر ملک و قوم کی  
خدمت کروں گا۔



محمد عثمان حسین، راولپنڈی  
میں ڈاکٹر بن کر غربیوں کا مفت علاج  
کروں گا۔



محمد عبداللہ ثاقب، پشاور  
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کا نام  
روشن کروں گا۔



روشن زیب، ایٹ آباد  
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت  
کروں گا۔



محمد حسان رضا، واہ کینٹ  
میں فوج میں جا کر اپنے ماں باپ کا  
نام روشن کروں گا۔



فاطمہ آفتاب، کراچی  
میں حافظہ قرآن بننا چاہتی ہوں اور  
والدین کے ساتھ حج کرنے کی  
خواہش ہے۔



فاطمہ افتخار، کراچی  
میں ڈاکٹر بنوں گی اور انسانیت کی  
خدمت کروں گی۔



احمد افضل، لاہور  
میں دین اسلام کا مجاہد بنوں گا۔



عاصم محمود، اسلام آباد  
میں وطن اور اپنے ہم وطنوں کی  
خدمت کرنا چاہتا ہوں۔



محمد سمیع، کراچی  
میں اسلام کی تعلیمات پھیلاؤں گا۔



اقصی شہزادی، گجرات  
میں ڈاکٹر بن کر دینی انسانیت کی  
خدمت کروں گی۔



عبدالحکیم، کراچی  
میں اللہ اور رسول کی تعلیمات پر عمل  
پیرا ہوں گا۔









|   |   |   |   |   |   |   |   |   |   |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ا | ڈ | ف | س | و | ی | ک | س | ث | ظ |
| ے | ش | ح | ے | ف | ل | ق | غ | ص | ش |
| ع | ک | م | ع | ب | ج | ا | ث | ن | ل |
| ر | و | ف | ا | ت | ح | ہ | ذ | ص | چ |
| ب | ث | د | پ | ص | ی | ب | د | ر | ب |
| ک | ر | ج | ف | ا | ر | ع | ا | م | خ |
| ف | ء | ض | ر | ز | ن | ق | غ | ز | ش |
| ر | ج | ا | ن | ع | ا | م | پ | م | و |
| ع | ڑ | ٹ | س | ہ | ط | خ | ت | ل | ی |
| د | م | ف | ر | و | ط | ک | غ | ر | ا |

PDFBOOKSFREE.PK

آپ نے حروف ملا کر دس قرآنی سورتوں کے نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن ناموں کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں۔

فاتحہ، نصر، یوسف، کوثر، اعراف، منزل، انعام، طور، فلق، رعد



زبیدہ سلطانہ

محاورہ کہانی

# جان پیاری ہونا

ڈالا تو اس کے سینک دیکھے میں پھنس گئے۔ بیل سخت گھبرایا کہ یہ کیا نئی آفت آگئی ہے۔ وہ زور زور سے دیکھے میں پھنسا سر ٹکراتا دالان میں آگھسا۔ اندھیرے میں بڑھیا اس خوف ناک چیز کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئی۔ وہ سمجھی کہ اس کی دُعا قبول ہو گئی ہے اور ملک الموت کو اس کی روح قبض کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ وہ مارے ڈر کے لرزے اور ہاتھ جوڑ کر گھگھیا نے لگی: ”اے ملک الموت! میں مہتی تو نہیں ہوں..... میں تو ایک حقیر سی بوڑھی عورت ہوں، مہتی تو وہ بستر میں پڑی ہے تو اسی کو لینے آیا ہے، اسے لے جا، مجھے معاف کر دے!“

وہ خوف سے کانپتی اور بیل کے آگے ہاتھ جوڑتی چھپنے کی جگہ ڈھونڈ رہی تھی۔ بیل ادھر ادھر ٹکریں مارتا چاروں طرف دوڑ رہا تھا۔ اتفاق سے اس کا رخ دروازے کی طرف ہو گیا اور وہ دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ مہتی بھی جاگ گئی تھی۔ اسے خوف کے مارے اتنا پسینہ آیا کہ اس کا بخار اتر گیا۔ وہ ماں کی باتیں سن کر ہنسی اور کہنے لگی: ”اپنی جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ بس یہ کہنے کی باتیں ہیں کہ فلاں کی جگہ میں مر جاؤں، میری عمر فلاں کو لگ جائے۔ میری ماں کی تو سب دعائیں بھی زبانی ہی تھیں۔“

☆.....☆.....☆

ایران کے کسی قصبے میں ایک ضعیف عورت رہتی تھی، جس کی ایک ہی بیٹی تھی۔ دونوں ماں بیٹی حلیم پکا کر بیچا کرتیں اور اسی پر گزر بسر تھی۔ ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ بیٹی جس کا نام مہتی تھا، بیمار ہو گئی۔ بڑھیا نے اس کا مقدور بھر علاج کرایا مگر بیماری زور پکڑتی گئی۔ بوڑھی عورت بے حد پریشان تھی۔ ایک تو حلیم پکانے کا سارا کام اس کے ضعیف کندھوں پر آن پڑا تھا، دوسرا بیٹی کی بیماری پر بہت خرچ ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ اچھی بھی نہیں ہو رہی تھی۔ ماں دن رات اس کی صحت کے لیے دُعا کرتی۔

ایک سرد، طوفانی رات کا ذکر ہے کہ بارش اور ہوا کا زور تھا اور بہت سردی تھی۔ ماں بیمار مہتی کے سرہانے بیٹھی ہر روز کی طرح اس وقت بھی دعا مانگ رہی تھی: ”یا اللہ! میری بیٹی کو اچھا کر دے، میری عمر بھی اس کو لگ جائے، اس نے ابھی دُنیا میں دیکھا ہی کیا ہے، اس کے بدلے میری جان لے لے۔“

وہ لگاتار یہی فقرہ دہرا رہی تھی کہ اتنے میں صحن کے صدر دروازے کی کنڈی ہوا کے زور سے کھل گئی اور ایک بھولا بھٹکا، طوفان سے گھبرایا ہوا بھوکا بیل اندر گھس آیا۔ اس نے چولہے پر ایک بڑا دیکھ دیکھا جو بڑھیا نے حلیم ختم ہونے پر بغیر دھوئے صحن میں رکھ چھوڑا تھا۔ بیل نے کھانے کی تلاش میں دیکھے کے اندر منہ



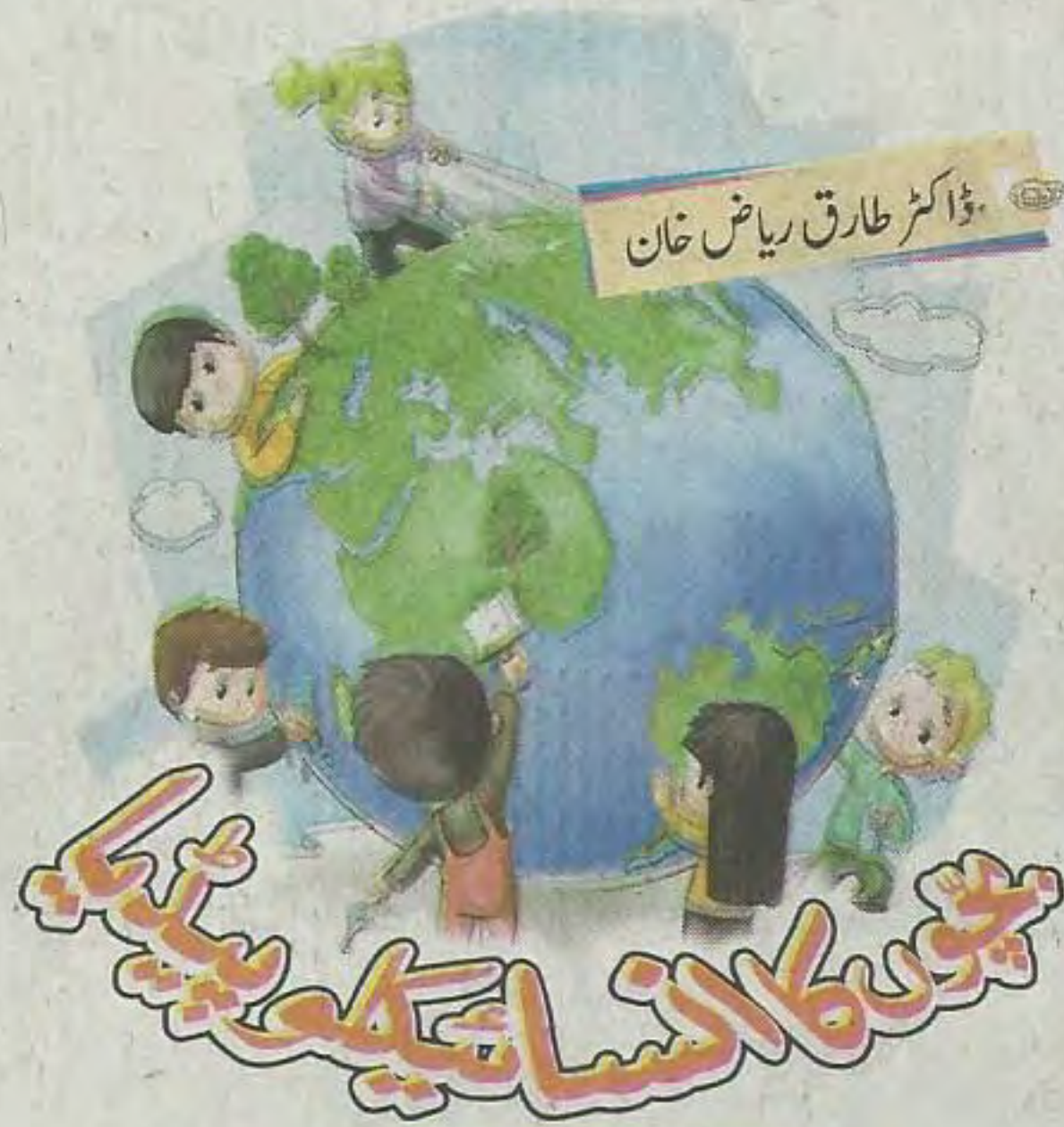
ہاں، دو مینار، خواب گاہ دیوان عام اور دیوان خاص کے علاوہ دو دروازے بھی موجود ہیں۔ باغ میں بہت سے درخت اور پودے بھی لگے ہیں۔ اس باغ میں میلہ چراغاں کے موقع پر بڑا ارش ہوتا ہے۔ دُنیا بھر سے سیاح آتے ہیں۔ غیر ملکی مہمانوں کو بھی شہریوں کی طرف سے اسی باغ میں ظہرانہ دیا جاتا ہے۔ 1981ء میں اقوام متحدہ نے اس باغ کو ثقافتی ورثے کا درجہ دے دیا ہے۔

## کینگرو

آسٹریلیا کا قومی جانور کینگرو (Kangaroo) ہے۔ اس کا سائنسی نام "Macropus" ہے جب کہ اس کا خاندان "Macropodidae" کہلاتا ہے۔ لفظ کینگرو کا مطلب ہے "میں نہیں جانتا۔" کیوں کہ اسے رپورٹ کرنے والے ماہر سر جوزف بنکس اور ان کے ساتھی لیفٹیننٹ کک (Cook) نے جب پہلی بار اسے دیکھ کر ایک شخص سے اس جانور کا نام پوچھا تو مقامی شخص نے کہا کینگرو یعنی میں نہیں جانتا۔ ماہرین نے اس کا

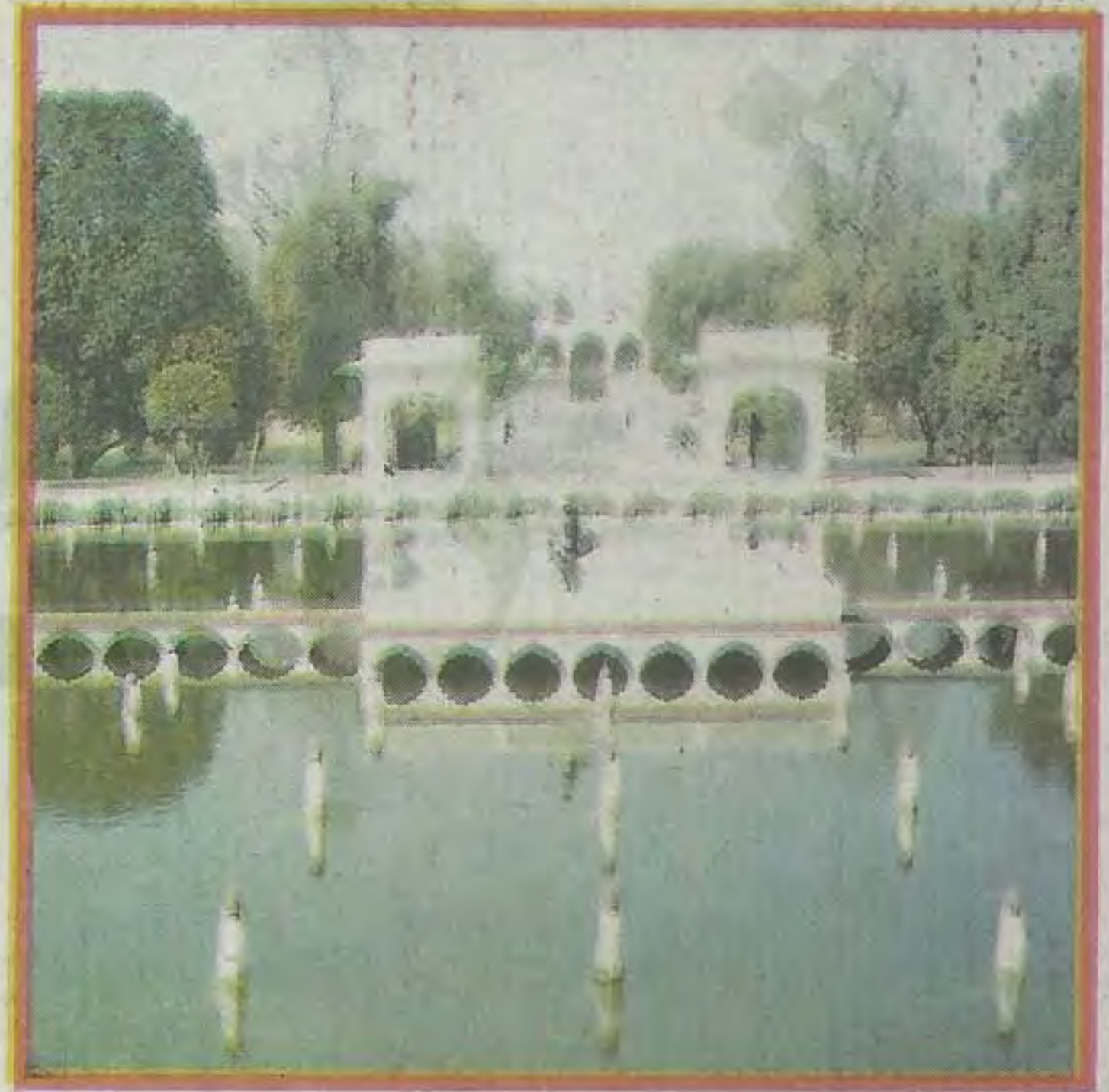


نام کینگرو رکھ دیا۔ نر کینگرو کو "Bucks" مادہ کینگرو کو "Jills" جب کہ بچے کو "Joeys" کہا جاتا ہے۔ سرخ کینگرو "Macropus Rufus" دُنیا کا سب سے بڑا کینگرو جانور ہے۔ ایک بڑا نر 2 میٹر (6 سے 7 فٹ) لمبا اور 90 کلو (200 پاؤنڈز) وزنی ہوتا ہے۔ یہ جانور چھلانگیں لگا کر حرکت کرتا ہے۔ سرخ کینگرو 20 سے 25 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا ہے۔ یہ جانور پتے کھا کر گزارہ کرتا ہے۔ یہ جانور گروہ بنا کر رہتا ہے۔ گروہ کو



## شالا مار باغ

شالا مار باغ مغل شہنشاہ شاہجہاں نے 1641ء میں لاہور شہر میں تعمیر کروایا۔ اس کا باضابطہ افتتاح 1642ء کو ہوا۔ باغ مستطیل شکل کا ہے جس کے گرد دیواریں قائم ہیں۔ باغ میں پانی کے



تالاب ہیں جن پر فوارے نصب ہیں جن کی تعداد 410 ہے۔ پانچ آبشاریں اور آرام کے لیے عمارتیں بھی قائم ہیں۔ شمال سے جنوب یہ باغ 658 میٹر اور مشرق سے مغرب کی جانب یہ 258 میٹر ہے۔ باغ میں تین بلند مقام (Terraces) ہیں جو 4 سے 5 میٹر (13 سے 15 فٹ) بلند ہیں۔ سب سے بلند مقام پر 105 فوارے، درمیانی مقام پر 152 فوارے اور سب سے نچلے حصے میں 153 فوارے لگے ہیں۔ باغ میں آرام گاہ، حمام، ایک



سائنس دان دُنیا سے رخصت ہو گیا۔

## ڈاک خانہ

ڈاک خانہ یا پوسٹ آفس، خطوط اور پارسل کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جانے کا کام کرتا ہے۔ پوسٹ آفس کا لفظ پہلی بار 1650ء کی دہائی میں بولا گیا۔ اس سے پہلے انگلینڈ کے لوگ اسے پوسٹ ہاؤس یا میل سروس کہا کرتے تھے۔ امریکہ کے لوگ ڈاک خانے کو اسٹیشن بھی بولتے تھے۔ خیال ہے کہ فرعون کے

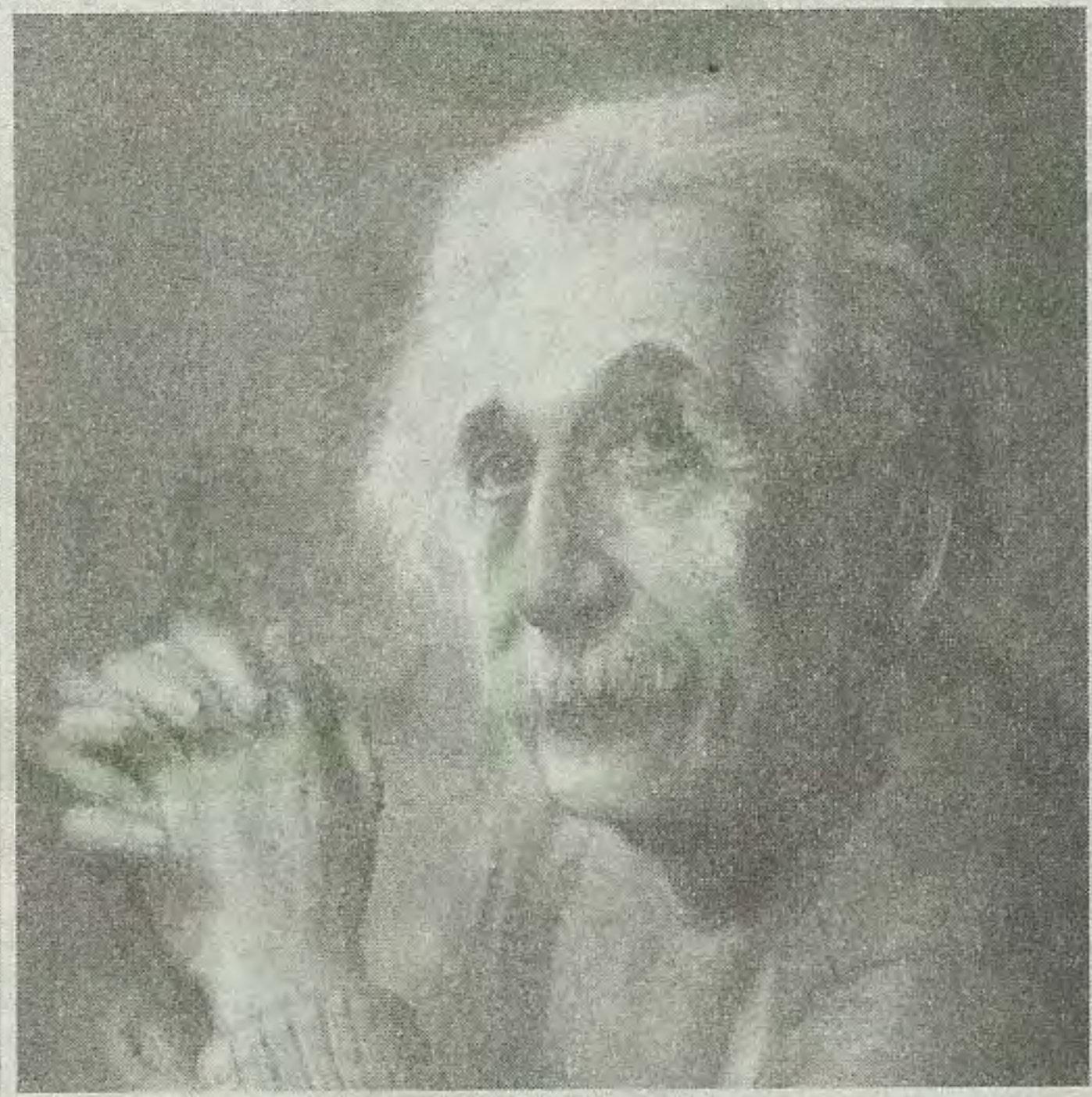


زمانے سے (2400 قبل مسیح) انسان خطوط کے ذریعے پیغام رسانی کر رہا ہے۔ ایران میں ڈاک کا مرکزی نظام "Chapar Khaneh" بھی اپنے وقت کا جدید نظام تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں ہندوستان اور چین میں بھی ڈاک کا نظام شروع ہوا۔ جدید دُنیا کا قدیم ترین ڈاک خانہ ہائی سٹریٹ سکاٹ لینڈ کو سمجھا جاتا ہے جو 1712ء سے آج تک کام کر رہا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب گھوڑوں اور بارہ سینکلوں کی بگھی سے ڈاک ترسیل کی جاتی تھی۔ پاکستان میں جنرل پوسٹ آفس (GPO) 1887ء کو لاہور میں قائم کیا گیا۔ دُنیا کا قدیم ترین جنرل پوسٹ آفس ڈبلن (Dublin) میں 1814ء سے قائم ہے۔ لاہور کا جنرل پوسٹ آفس ملک کا سب سے بڑا ڈاک خانہ ہے جہاں روزانہ 20,000 سے زائد ڈاک ترسیل کی جاتی ہے۔ ہر سال 9 اکتوبر کو ڈاک کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔

"Mobs" کہتے ہیں۔ مادہ کے پیٹ پر تھیلی ہوتی ہے جسے "Marsupium" کہتے ہیں۔ نیا پیدا ہونے والا بچہ اس تھیلی میں رہتا ہے اور ماں کا دودھ پیتا ہے۔ آسٹریلیا کی فورسز کی وردی پر اس جانور کا نشان نصب ہوتا ہے۔ آسٹریلیا کے لوگ اسے کھاتے ہیں۔ یہ پروٹین سے بھرپور ہوتا ہے۔

## البرٹ آئن سٹائن

البرٹ آئن سٹائن (Albert Einstein) ایک جرمن ماہر طبیعیات تھے۔ جو جرمنی کے شہر الم میں 14 مارچ 1879ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام ہرمن آئن سٹائن تھا جب کہ والدہ کا نام پالین (Pauline Koch) تھا۔ مذہب کے لحاظ سے یہ خاندان یہودی تھا۔ البرٹ آئن سٹائن کی شادی سربیا کی خاتون میلوا مارک (Mileva Maric) سے ہوئی۔ یہ جنوری 1903ء



میں انجام پائی۔ آئن سٹائن کی بیوی بھی فزکس کی ماہر تھی۔ البرٹ آئن سٹائن نے روشنی، مائع کی حرکت، مادہ اور انرجی کا تعلق اور خصوصی اضافیت (Relativity) کا نظریہ پیش کر کے سائنسی میدان میں خوب نام کمایا۔ 1906ء میں زیورخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد اسی یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے۔ آپ کے بیٹے Hans نے بھی سویٹزرلینڈ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ آپ کا دوسرا بیٹا ایڈورڈ ذہنی طور پر معذور تھا۔ آئن سٹائن کی دوسری بیوی کا نام Elsa تھا۔ 18 اپریل 1955ء کو یہ عظیم



9- علامہ محمد اقبالؒ کے مرشد کون تھے؟

i- خیام ii- مولانا روم iii- حافظ شیرازی

10- مسجد مہابت خان کس شہر میں ہے؟

i- لاہور ii- پشاور iii- کراچی

### جوابات علمی آزمائش فروری 2014ء

1- ابرہہ 2- وارث النبی فی الہند 3- جینٹلس 4- مرزا غالب 5- سادہ پانی 6- دریائے کابل 7- سات کھلاڑی 8- وادی کاغان 9- مولوی فضل الحق 10- اسپین  
اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ محمد فریاد علی قادری، کاموکی (150 روپے کی کتب)

☆ سونیا ذوالفقار خان، مردان (100 روپے کی کتب)

☆ منزل عطاء، کراچی (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:  
مریم سلیمان بٹ، مریم صدیقہ، خدیجہ فہد، گوجرانوالہ۔ اقصیٰ سجاد، ہاجرہ ابراہیم ورک، راول پنڈی۔ صہیب نور، انوشہ منظور، کراچی۔  
مریم اکرام، لاہور۔ کوثر سلیم، سیال کوٹ۔ زارا وہاب، ہمایوں رشید، اسلام آباد۔ محمد کامران سعید، فیصل آباد۔ عشاء سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔  
نحبہ راجہ، پنڈ دادنخان۔ محمد عبداللہ نیازی، بھکر۔ ضحیٰ بدر، لاہور۔ طاہر عبداللہ، قلعہ دیدار سنگھ۔ محمد عتیق الرحمن، میرپور۔ عمارہ حسن، اسلام آباد۔ عائشہ سعید، راہوالی۔ مدیحہ ارشد، گجرات۔ عاصم طفیل، گوجرانوالہ۔ زینب ناصر، فیصل آباد۔ فاطمہ سلیم، لاہور۔ ثمرہ طارق بٹ، اروپ۔ ماہم اعجاز، گوجرانوالہ۔ تحریم نثار، نداجمال، سرگودھا۔ محمد مجیر خان، بھکر۔ ضرار عظیم ملک، مریدکے۔ معزز طارق، راول پنڈی۔  
رملہ صدیقی، سرگودھا۔ زینب ہارون، نوشہرہ۔ عبداللہ شاہ، دریا خان۔ حفظہ اعجاز، بارہ ہملٹ۔ زینب محمود، گوجرانوالہ۔ لائبہ عابد، کراچی۔ ولید اشرف، گوجرہ۔ افشین زمان، کرک۔ محمد قمر الزمان، خوشاب۔ محمد فاروق گوندل، کراچی۔ محمد ریان احمد، اسلام آباد۔ محمد جنید ناگرو، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔  
محمد اکرم صدیقی، میاں والی۔ محمد ہاشم اسلم، گوجرانوالہ۔ ایمان فاطمہ، راول پنڈی۔ رضوان اشہد، پشاور۔ محمد فیاض الحسن، چکوال۔ فاطمہ الزہرہ، فیصل آباد۔ ماہم اکرم، فیصل آباد۔ محمد اسماعیل خان، لاہور۔ محمد حنان فیصل، فیصل آباد۔ محمد عبداللہ ثاقب، پشاور۔ محمد نعیم امین، لاہور۔



درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1- قرآن پاک میں افریقہ کے کس عرب شہر کا نام آیا ہے؟

i- مصر ii- حبشہ iii- روم

2- مولانا محمد علی جوہر کہاں مدفون ہیں؟

i- بیروت ii- یروشلم iii- استنبول

3- آتشیں چٹانیں کس چیز سے بنتی ہیں؟

i- میگما ii- چونا iii- پوٹاشیم

4- سمت معلوم کرنے کے لیے کون سا آلہ استعمال ہوتا ہے؟

i- الٹی میٹر ii- قطب نما iii- فیتھو میٹر

5- دو قبلوں والی مسجد کا کیا نام ہے؟

i- مسجد نبویؐ ii- مسجد نمروہ iii- مسجد قبلتین

6- ترکی کا قومی نشان کون سا ہے؟

i- عقاب ii- انار iii- بھیڑیا

7- زہرا کے معنی روشن کے ہیں، یہ کن کا لقب تھا؟

i- حضرت خدیجہؓ ii- حضرت فاطمہؓ iii- حضرت عائشہؓ

8- یہ شعر کس مشہور شاعر کا ہے؟

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام

وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

i- اکبر الہ آبادی ii- مولانا ظفر علی خان iii- علامہ اقبال





## چکن چائومن

### اجزاء:

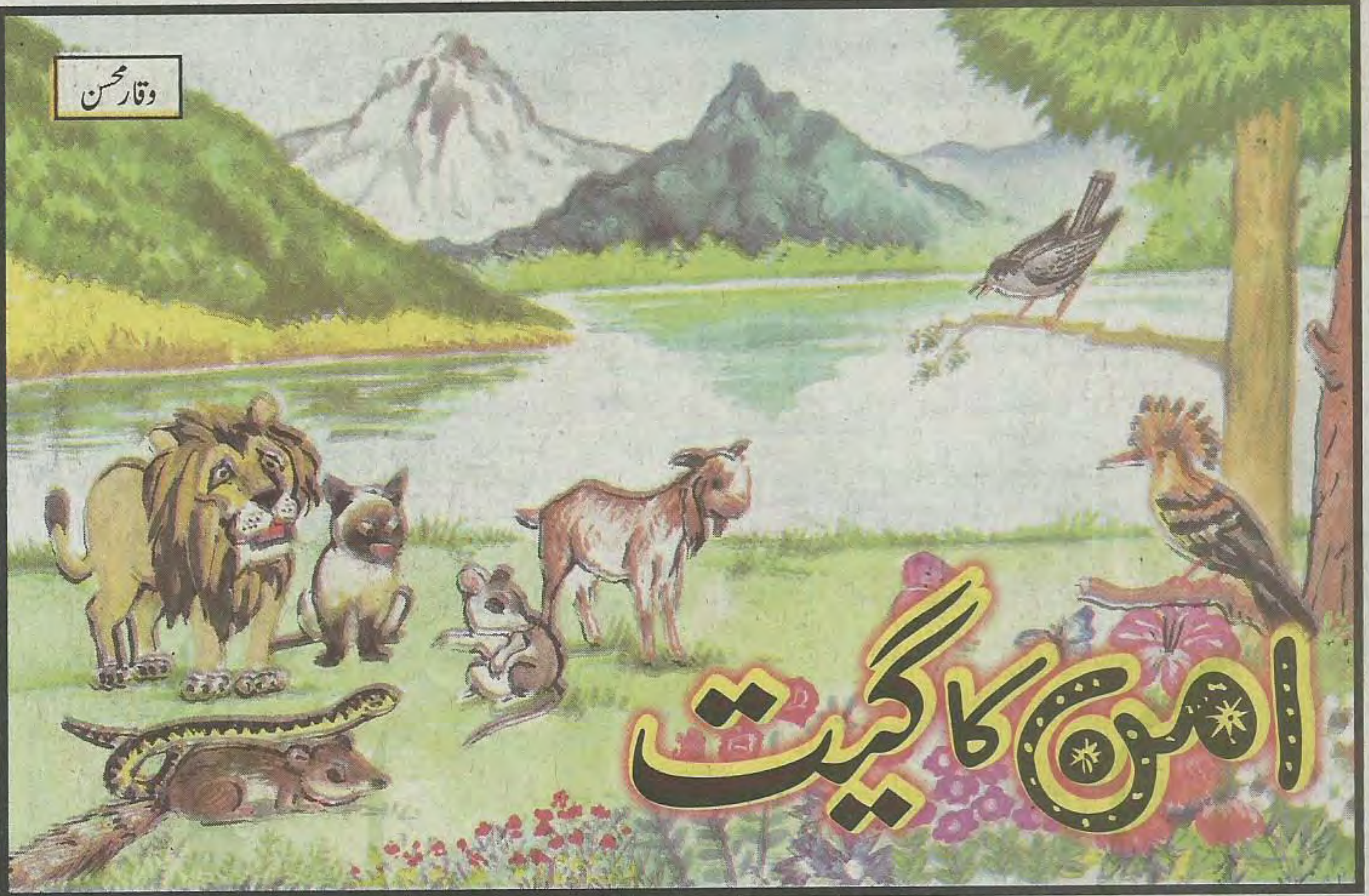
|                                                                 |                                     |                 |
|-----------------------------------------------------------------|-------------------------------------|-----------------|
| مرغ کا گوشت (ریشہ شدہ) 1 کپ                                     | چائیز نمک                           | 1/2 چائے کا چمچ |
| سویا ساس                                                        |                                     |                 |
| گوشت کو چائیز نمک اور سویا ساس لگا کر 10-15 منٹ کے لیے رکھ دیں۔ |                                     |                 |
| چائیز ایگ نوڈلز                                                 | 1/2 پیکٹ، سخت اباں کر ٹھنڈا کر لیں۔ |                 |
| گاجر، پیاز، کشمیری مرچ                                          | 1 کپ (باریک لمبائی میں کٹی ہوئی)    |                 |
| پسی ہوئی کالی مرچ                                               | 1/2 چائے کا چمچ                     |                 |
| نمک                                                             | حسب ذائقہ                           |                 |
|                                                                 | نخنی                                | 1/2 کپ          |
|                                                                 | چائیز نمک                           | 1/2 کپ          |
|                                                                 | سویا ساس                            | 1/4 کپ          |
|                                                                 | 1 چائے کا چمچ                       |                 |
|                                                                 | آئل                                 | 1/2 کپ          |

### ترکیب:

- ☆ 1/4 کپ آئل گرم کریں۔ ابلی ہوئی نوڈلز اس میں ڈال کر 2 منٹ فرائی کر کے نکال لیں۔
- ☆ اب باقی آئل گرم کر کے مرغ کے گوشت کو بھون لیں۔ اس میں نخنی ڈال کر پکائیں۔
- ☆ جب خشک ہو جائے تو سبزیاں ڈال کر مزید 2 منٹ پکائیں۔ اب اس میں سویا ساس، چائیز نمک، نمک اور کالی مرچ ڈال دیں۔ اوپر تلی ہوئی نوڈلز ڈال دیں اور آگ سے اتار لیں۔
- ☆ نوڈلز اباں کرنے کا طریقہ: گرم ابلتے ہوئے پانی میں نوڈلز ڈال دیں۔ ایک بڑا چمچ تیل کا بھی شامل کریں۔ جب نوڈلز کی ایک کئی رہ جائے تو چھلنی میں ڈال دیں اور فوراً ٹھنڈا پانی ڈال دیں۔ اس سے نوڈلز چپکتے نہیں ہیں۔



وقار محسن



# امیج کا گیت

بھرے آلوچوں، سنب اور ناشپاتی کی جگہ خاردار جھاڑیوں میں مردہ جانوروں کی لاشیں بکھری ہوئیں۔ چاروں طرف رچی خوشبو کی جگہ ناقابل برداشت بدبو پھیلی ہوئی۔ اس زمانے میں پورا جنگل دو گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔ گروہ میں بٹا ہونا یا گروہ بنا لینا کوئی غلط بات نہیں لیکن اگر گروہ کی بنیاد نفرت، انتقام اور دشمنی پر ہو تو ایسے گروہ تباہ کن ہوتے ہیں۔ ہاں تو جنگل کے جنوب میں جہاں میلوں تک بانس کے جھنڈ پھیلے ہوئے تھے وہاں ہاتھی کا راج تھا۔ ہاتھی کے بہت سے خوشامدی اس کے گرد جمع رہتے اور کہتے:

”جانوروں کے بادشاہ! آپ کو پورے بن کا بادشاہ ہونا چاہیے۔ آخر شیر کو کیا حق ہے کہ آدھے بن کا نام نہاد بادشاہ بنا بیٹھا ہے۔ ٹانگ برابر شیر کی یہ ہمت کہ آپ جیسے طاقتور شہنشاہ کا مقابلہ کرے۔“

گیدڑ دانت نکال کر کہتا: ”ذرا ہمارے حضور کی دم تو دیکھیں۔ کیا لا جواب دم ہے۔“ بھیڑیا ہاتھی کے پیر دباتے ہوئے کہتا:

”اور سوئڈ تو ہمارے شہنشاہ کی شان ہے۔ صرف ان کو قدرت نے اس نعمت سے نوازا ہے۔“ زیر ہاتھی کی مالش کرتے ہوئے کہتا:

”ہم نے تاریخ میں پڑھا ہے کہ جب قطب الدین ایبک کو اتنی اونچی سیڑھی نہیں ملی تو قطب مینار بنانے کے لیے آپ ہی کی قوم کام آئی۔“

برف سے ڈھکی پہاڑوں کی چوٹیوں کے درمیان نیلم گھاٹی انگوٹھی میں جڑے فیروزے کے نگ کی مانند لگتی تھی۔ سانپ کی طرح بل کھاتی چندن ندی کے اس پار سندھ بن (جنگل) تھا جہاں شیر، بکری، بلی، چوہا، سانپ اور نیولے کو بھی ساتھ کھیلتے دیکھا گیا۔ ساون بھادوں سندھ بن کا وہ حصہ ہے جہاں جنگلی گلاب اور چنبیلی کی گنجان بلیں اس طرح چاروں طرف پھیلی ہیں کہ سورج کی کرنیں بھی اندر داخل نہیں ہو پاتیں۔ اکثر دیکھا گیا کہ جب دوپہر کے کھانے کے بعد شیر اور چیتے قیلولہ کرنے ساون بھادوں کے سائے میں لیٹتے تو ہمدرد بڑھتی اپنی نوکیلی چونچ سے ان کے دانت صاف کرتا۔ جب بی فاختہ گھونسے کے لیے تنکے تلاش کرنے جاتیں تو اپنے انڈے اپنے پڑوسی کو لے کے سپرد کر جاتیں۔ اگر کسی دن شہد کی مکھیاں بن میں نہیں آتیں تو پھولوں کے گرد ناچتی تتلیاں خود شہد جمع کر کے مکھیوں کے چھتے پر پہنچا دیتیں۔ سندھ بن کے حسن کا راز یہی پُر امن زندگی تھی۔

اس بے مثال پیار اور دوستی کے پیچھے نفرت اور دشمنی کی ایک لمبی داستان ہے۔ تقریباً دو سو سال پہلے یہ حسین وادی ویران اور بے رنگ تھی۔ چندن ندی کا پانی جو آج پکھلی چاندنی کی مانند شفاف نظر آتا ہے، پہلے جانوروں کے خون سے گدلا رہتا تھا۔ رس



اس قسم کی باتیں سن کر ہاتھی خوش ہوتا اور شیر کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے نئے نئے منصوبے بناتا۔

نیلیم ندی کے اس پار چیڑ کے جنگل میں شیر کی حکومت تھی۔ شیر کو اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جسمانی طاقت کے ساتھ پھرتی اور عیاری ایسے ہتھیار ہیں جن سے بڑے سے بڑے دشمن کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ شیر کے پاس بھی اس کے خوشامدی جمع رہتے جو شیر کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں کے لالچ میں شیر کی جھوٹی تعریفیں کرتے۔

اکثر دونوں گروہوں میں جھڑپیں ہوتیں اور دونوں طرف سے سینکڑوں جانور مارے جاتے۔ تباہی اور بربادی کے اس کھیل کے بعد دونوں گروہ پھر سے نئے نئے تباہ کن ہتھیار کی تلاش میں لگ جاتے تاکہ دشمن کا پہلے سے زیادہ نقصان کیا جائے۔

ایک دن ہاتھی کو نیل کنٹھ نے آکر خبر دی کہ ندی کے کنارے مولسری کے درخت کے نیچے ایک بزرگ بیٹھے ہیں جن کے سر کے بال، بھوئیں اور پلکیں تک روئی کی طرح سفید ہیں۔ وہ کوئی راگ گا رہے ہیں۔ وہ نہ جانے کیسا جادو بھرا گیت ہے کہ بادلوں کی ٹکڑیاں نیچے اتر آئی ہیں اور ہوا بھی رک گئی ہے۔ ہزاروں چرند پرند ان کے گرد جمع ہیں۔ جب وہ بزرگ خاموش ہوئے تو گینڈے نے ان سے پوچھا کہ یہ کون سا گیت ہے تو اس بزرگ نے مسکرا کر جواب دیا:

”یہ امن کا گیت ہے میرے دوست۔“

”یہ امن کیا ہوتا ہے؟“ ہاتھی نے اپنی مختصر سی دم ہلا کر پوچھا۔ زیرے نے کچھ سوچ کر جواب دیا:

”معلوم نہیں حضور! لیکن بہر حال یہ امن کوئی بہار جیسی کوئی چیز ہے کیوں کہ جو خوشی اور جوش کی لہر بہار کے موسم میں محسوس ہوتی ہے وہی امن کا گیت سن کر محسوس ہوتی ہے۔“

ہاتھی کچھ دیر تک سوئڈ سے اپنا سر کھجاتا رہا پھر بولا:

”بھئی وہ کوئی بہت پہنچے ہوئے بزرگ لگتے ہیں۔ ہم ان سے ضرور ملاقات کریں گے اور درخواست کریں گے کہ وہ ہمیں کوئی ایسا ہتھیار بتائیں جس سے شیر اور اس کے ساتھیوں کا نام و نشان مٹ جائے۔“

ہاتھی اگلے دن اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ اس بزرگ کے پاس پہنچا اور درخواست کی:

”حضور! یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسے عالم بزرگ ہمارے جنگل میں آئے۔ ہم لوگ شیر کی حرکتوں سے بہت تنگ آگئے ہیں۔ براہ کرم ہمیں کوئی ایسا مہلک ہتھیار بتائیں جس سے ہمارے دشمن کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔“

بزرگ خاموشی سے ہاتھی کی باتیں سنتے رہے پھر مسکرا کر بولے:

”میرے دوست! اکثر گناہوں کی سزا گناہ سرزد ہونے کے بعد ملتی ہے لیکن حسد اور نفرت ایسے گناہ ہیں جن کی سزا فوراً شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن شاید تم میری بات ابھی نہ سمجھو۔ ویسے میرے پاس ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے تمہارا دشمن ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔“

اتنا کہہ کر وہ بزرگ اپنی کنیا میں گئے اور ایک سر بند لفافہ ہاتھی کو دیتے ہوئے کہا:

”اس میں ایک ایسا خطرناک سفوف ہے کہ جیسے ہی تمہارا دشمن اس کو کھولے گا اس کے جراثیم فضا میں پھیل جائیں گے اور میلوں تک دشمن کا خاتمہ ہو جائے گا۔ تم کل صبح ہی یہ لفافہ اپنے دشمن کو بھجوادو۔“

ہاتھی بہت خوش ہوا کہ بغیر کسی جنگ کے دشمن کا صفایا ہو جائے گا۔ دوسری طرف شیر کو بھی اس کے ساتھیوں نے اس بزرگ کی آمد کی خبر دی اور اس نے بھی سوچا کہ اس بزرگ سے مل کر کوئی ایسا ہتھیار دریافت کرنا چاہیے جس سے ہاتھی کو ختم کیا جاسکے۔ شیر کے ساتھیوں نے بانسوں کی کشتی بنائی اور رات کے وقت ندی کے اس پار اس بزرگ کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت وہ بزرگ عبادت میں مشغول تھے۔ اس کی صابن کے جھاگ جیسے داڑھی اور سر کے بال اس کی گود میں پھیلے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد وہ شیر کی طرف متوجہ ہوا اور شیر سے آنے کی وجہ پوچھی۔ شیر نے گڑگڑا کر کہا:

”حضور! ہم آپ کی کرامتوں کے چرچے سن کر آئے ہیں۔ سنا ہے آپ کا گیت سن کر ہوا رک جاتی ہے، دریا ٹھہر جاتے ہیں۔ سرکار! مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہاتھی نے پریشان کر رکھا ہے۔ ہاتھی ایک شر پسند جانور ہے۔ اس کے دانت کھانے کے اور ہیں، دکھانے کے اور ہیں۔ ہم صدیوں سے ہاتھی کے خلاف مختلف ہتھیار استعمال کرتے آئے ہیں لیکن ہم ابھی تک دشمن کو ختم نہیں کر پائے۔ سنا ہے انسان نے درندگی میں ہمیں بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے اور ایک انڈے کے برابر ایسا بھیانک ہتھیار ایجاد کیا ہے جو منٹوں میں ہری بھری زمین کو



قبرستان میں تبدیل کر سکتا ہے۔“ شیر کی بات سن کر بزرگ اپنی سفید موتیوں کی مالا گھماتے ہوئے بولا:

”میرے دوست! انسان کبھی تباہ کرنے والی چیز نہیں بناتا۔ شیطان مختلف بھیس میں ظاہر ہوتا ہے۔ شیطان جب انسان کے بھیس میں ظاہر ہوتا ہے تو وہ ایسے ہتھیار ایجاد کرتا ہے۔ انسان کا کام تو محبت کرنا، تاج محل بنوانا، باغوں میں پھولوں کو سینچنا اور امن کے جادو بھرے گیت گانا ہے۔ بہر حال تم میرے پاس بڑی امید لے کر آئے ہو اس لیے میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔“

اتنا کہہ کر بزرگ اپنی کٹیا میں گئے اور ایک سر بند لفافہ شیر کو بھی لا کر دیا اور کہا:

”اس میں ایک نہایت خطرناک سفوف ہے۔ تمہارا دشمن جب لفافہ کھولے گا تو ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گا۔“

شیر لفافہ لے کر خوشی خوشی واپس چلا گیا۔ اگلی صبح جب شیر سو کر اٹھا تو ہرن نے اسے ایک لفافہ لا کر دیا جو کوئی شیر کے غار کے دہانے پر ڈال گیا تھا۔ دراصل یہ لفافہ ہاتھی نے شیر کے غار میں پھنکوا دیا تھا۔ شیر کے بچے اعلیٰ تعلیم کے لیے افریقہ کے جنگلات میں گئے ہوئے تھے، اس لیے اس نے سوچا کہ اس کے بچوں کا خط آیا ہے۔ اس نے بے تابی سے خط کھولا۔ شیر کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ یہ خط ہاتھی کی طرف سے تھا جس میں لکھا تھا۔

”میرے بہت پیارے دوست! شیر! آداب۔“

آج یہ خط لکھ کر میں اس دشمنی کو ختم کر دینا چاہتا ہوں جس کے زہر پے بیج ہمارے بزرگوں نے بوئے تھے۔ میں تمہیں جنگل کا بادشاہ تسلیم کرتا ہوں کیوں کہ تم واقعی سب سے طاقت ور اور بہادر جانور ہو۔ ہماری غلط فہمیوں نے اس خوب صورت بن کو ویران کر دیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہم جانور بھی انسان کی طرح اس پیاری زمین پر تباہی پھیلائیں۔ انسان ہمیشہ سے ہمارا دشمن رہا ہے۔ وہ شیر اور ہاتھی کو پکڑ کر لے جاتا ہے اور چڑیا گھر میں ان کو گیدڑ سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے۔ اگر ہم آپس میں لڑتے رہے تو انسان کا مقابلہ کیسے کریں گے۔ پرانی نفرت کو بھول جاؤ۔ آؤ ہم سب مل کر بہاروں کو اس بن میں واپس لے آئیں۔ میں کل دریا کے کنارے سیب کے باغ میں تمہارا انتظار کروں گا۔“

ہاتھی کا خط پڑھ کر شیر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دوسری طرف ہاتھی کو بھی اس قسم کا لفافہ ملا کیوں کہ ہاتھی کا بھائی شیر کے کیمپ میں جنگی قیدی کی زندگی گزار رہا تھا، اس لیے ہاتھی نے اپنے بھائی کا خط سمجھا۔ ہاتھی نے جلدی سے لفافہ کھولا۔ خط شیر کی طرف سے تھا جس میں تحریر تھا۔

”بادشاہ، خادم کا سلام قبول ہو۔“ اس کے بعد شیر کے خط میں بھی وہی عبارت تھی جو ہاتھی کی طرف سے شیر کو ملا تھا۔ آخر میں شیر نے لکھا تھا کہ وہ کل چشمہ کے کنارے اس کا انتظار کرے گا۔ ہاتھی اور شیر نے جب اپنے اپنے ساتھیوں کو خط پڑھ کر سنائے تو سارا جنگل خوشی کے نعروں سے گونج اٹھا کیوں کہ ہر جانور خون خرابے کی زندگی سے تنگ آچکا تھا۔

اگلی صبح ندی کے دونوں کناروں پر ہزاروں چرند پرند جمع تھے۔ جانوروں کے ہاتھوں میں سفید گلاب کے جھنڈے تھے۔ شیر اور ہاتھی مور کے پنکھوں کے تاج پہنے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ سینکڑوں بانس کی کشتیاں دونوں طرف سے ندی میں اتریں اور آگے بڑھنے لگیں۔ ندی کے درمیان پہنچ کر شیر کو دریا کی کشتی میں آگیا اور دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ ایک کشتی میں وہی بزرگ خوب صورت کوڑیوں کی مالا پہنے ہرن کی کھال پر بیٹھے امن کا گیت گا رہے تھے۔ اس جادو بھری آواز سے درختوں اور پودوں کے بازوؤں سے کوئلیں پھوٹ رہی تھیں۔ بادل ان کی شیریں آواز سن کر بہت نیچے اتر آئے تھے اور خوشی سے جھومتے ہوئے چمکیلے موتی برسا رہے تھے۔ بزرگ نے گانا بند کر دیا اور جانوروں سے مخاطب ہوئے:

”میرے پیارے دوستوں! میں نے کہا تھا کہ ان لفافوں میں ایسا سفوف ہے جو دشمن کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا۔ آج یہاں کوئی کسی کا دشمن نہیں ہے۔ محبت دنیا کا سب سے طاقت ور ہتھیار ہے۔ دوسرے ہتھیار تو دشمن کو ختم کر سکتے ہیں لیکن محبت میں دشمنی اور نفرت کو ختم کرنے کی طاقت ہے۔“

آج بھی سندر بن میں جب ہوا سرسراتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی امن کا گیت گا رہا ہو۔





## ننھی فریدہ، طارق غائب ہو گیا

کہ میں تو بوڑھا ہو چلا ہوں۔ میری کوئی اولاد نہیں۔ کیا میں ہمیشہ اولاد کے لیے ترستار ہوں گا۔ میرے مرنے کے بعد میری اتنی بڑی کوٹھی، دکان اور موٹر کا مالک کون ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ اداس ہو گیا۔ وہ اپنی بیوی کے پاس آیا۔ اس کی بات سن کر بیوی بھی بہت دکھی ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اسی وقت صابر کا نوکر، بابا بھاگا ہوا آیا اور بولا۔ ”سرکار، نصیبین کا خاوند مر گیا۔“

یہ سن کر صابر اور اس کی بیوی بھاگ بھاگ نصیبین کے چھوٹے سے مکان میں آئے۔ نصیبین اپنے خاوند کی لاش پر رو رہی تھی۔ صابر کی بیوی کا دل بھی بھر آیا۔ وہ بھی رونے لگی۔ پھر اس نے نصیبین کو تسلی دی۔ صابر نے مرنے والے کے کفن و دفن کا انتظام کر دیا۔ صابر کی بیوی اب نصیبین کو ہر وقت اپنے پاس رکھتی۔ وہ جانتی تھی کہ نصیبین اپنے مکان میں جائے گی تو وہاں اکیلی بیٹھی روتی رہے گی۔ نصیبین کوٹھی میں کام بھی کرتی اور اپنی مالکن سے باتیں بھی کرتی رہتی۔ اس طرح اس کا دل لگا رہتا۔ نصیبین کو بھی اس بات کا رنج تھا کہ اس کی مالکن کا کوئی بیٹا بیٹی نہیں۔ وہ مالکن کے لیے دن رات دعائیں کرتی رہتی۔ آخر اس کی دعا قبول ہو گئی اور صابر کے گھر بچی پیدا ہوئی۔

صابر اور اس کی بیوی بہت خوش ہوئے۔ ان کے رشتے داروں کو پتا چلا تو وہ بھی مبارک باد دینے کے لیے دوڑے ہوئے آئے۔ سب

یہ دولت پور ہے، یہاں ایک پڑھا لکھا امیر آدمی رہتا تھا جس کا نام تھا صابر۔ صابر نے دوسرے امیروں کی طرح لوگوں کو لوٹ کر یا دھوکے سے دولت نہیں کمائی تھی۔ وہ جتنا پڑھا لکھا تھا، اتنا ہی نیک، ایمان دار اور رحم دل تھا۔ صابر کی بیوی بھی اُسی کی طرح نیک اور شریف عورت تھی۔ صابر کی دولت پور میں ایک بڑی اچھی کوٹھی تھی۔ شہر میں اس کی کپڑے کی دکان تھی۔ یہ دکان صابر کی ایمان داری کی وجہ سے خوب چلتی تھی۔ صابر کے گھر میں صرف دو نوکر تھے۔ ایک بوڑھا آدمی تھا، جسے بابا کہتے تھے اور دوسری ایک نوکرانی تھی جس کا نام نصیبین تھا۔ نصیبین کا خاوند بہت دنوں سے بیمار تھا۔ اس لیے کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ صابر اور اس کی بیوی دونوں اپنی نوکرانی کے بیمار خاوند کی دیکھ بھال کرتے اور اسے دوائیں منگوا کر دیتے تھے۔ صابر اپنے نوکروں کے علاوہ دوسرے غریب لوگوں کی بھی مدد کرتا تھا۔ دولت پور میں ہسپتال بنا تو صابر نے اس کے لیے سب سے زیادہ چندہ دیا۔ ایک بہت اچھا سکول کھلوا یا۔ بچوں کی سیر اور کھیلنے کے لیے خوب صورت پارک بھی بنوایا۔

صابر کو بچوں سے بہت محبت تھی لیکن اس کا اپنا کوئی بیٹا یا بیٹی نہ تھی۔ ایک دن وہ صبح کے وقت نہا کر کپڑے بدلنے لگا تو بڑے آئینے میں دیکھا۔ اسے اپنے سر میں کئی سفید بال نظر آئے۔ اس نے سوچا



فریدہ جماعت میں طارق کے ساتھ بیٹھتی۔ طارق سکول میں بھی فریدہ کو سبق یاد کراتا اور ہر طرح سے اس کی مدد کرتا تھا۔ فریدہ صبح کو سکول آتی تو اس کی جیب میں پیسے ہوتے۔ یہ پیسے وہ یونہی خرچ نہ کرتی۔ تفریح کے وقت کوئی اچھی چیز کھانے کے لیے لے لیتی۔ اس میں سے آدھا حصہ طارق کو دیتی۔ فریدہ کے چچا کا بیٹا جب فریدہ کو طارق کے ساتھ دیکھتا تو بہت جلتا۔ ایک روز تفریح کے وقت وہ فریدہ کو الگ لے گیا اور کہنے لگا۔ ”فریدہ، تم میرے تایا جان کی بیٹی ہو۔ میری بہن ہو۔ ہم دونوں امیر ہیں لیکن طارق غریب ہے۔ تمہاری نوکرانی کا بیٹا ہے۔ تم اس کے ساتھ نہ کھیلا کرو۔“

”کیوں نہ کھیلا کروں؟ وہ میرے ساتھ رہتا ہے۔ ہم اکٹھے سکول آتے جاتے ہیں۔ وہ مجھے پڑھاتا بھی ہے۔“

”ہوں! پڑھاتا بھی ہے۔“ جعفر نے تنک کر کہا۔ ”میں تمہیں پڑھا دیا کروں گا۔“ جعفر کی یہ بات سن کر فریدہ ہنسنے لگی اور بولی۔ ”تم مجھے پڑھاؤ گے۔ تمہیں تو خاک بھی نہیں آتا۔“ فریدہ کو ہنستا دیکھ کر جعفر کو غصہ آ گیا۔ اس نے کہا۔ ”کیا کھی کھی کر رہی ہو۔“

اتنے میں طارق اور دوسرے بچے بھی اس طرف آ گئے۔ فریدہ ابھی تک ہنس رہی تھی۔ وہ طارق سے کہنے لگی۔ ”سنو طارق، جعفر کہتا ہے میں تمہیں پڑھایا کروں گا۔“

”جعفر فریدہ کو پڑھائے گا۔“ ایک شریر لڑکے نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”جعفر سکول ٹیچر ہو گیا ہے۔“

”جعفر سکول ٹیچر ہو گیا ہے۔“ کئی بچوں نے ایک ساتھ کہا اور سب ہنسنے لگے۔ جعفر شرمندہ ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ تفریح کے وقت جعفر نے فریدہ سے کہا۔ ”آج تم میرے ساتھ گھر چلنا۔ امی جان نے تمہیں بلایا ہے۔ کہتی تھیں فریدہ کو ضرور ساتھ لے کر آنا۔“

فریدہ نے جواب دیا۔ ”میں نے صبح گھر میں بتایا نہیں تھا اس لیے میں نہیں جاسکتی۔“ جعفر نے کہا۔

”تم بھی نری پگی ہو۔ اس میں بتانے کی کیا بات ہے؟ تم کہیں پردیس تو نہیں جا رہی ہو۔ اپنے ہی گھر جانا ہے۔“ جعفر بولا۔ ”اچھا آؤ..... ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر سے تمہارے گھر میں فون کر دیتے ہیں۔“ یہ کہہ کر جعفر فریدہ کو دفتر میں لے گیا۔ وہاں سے فریدہ کی امی کو فون کیا۔ امی نے فریدہ کو اجازت دے دی۔ جب چھٹی ہوئی تو سب لڑکیاں اور لڑکے سکول سے باہر نکلے۔ فریدہ نے طارق سے کہا۔ ”آؤ طارق تھوڑی دیر کے لیے جعفر کے ہاں چلتے ہیں۔ چچی جان سے ملنا ہے پھر واپس اپنے گھر چلیں گے۔“

رشتے دار بے حد خوش تھے لیکن صابر کے چھوٹے بھائی کو بالکل خوشی نہیں ہوئی۔ صابر کا چھوٹا بھائی شہر میں رہتا تھا اور صابر سے زیادہ دولت مند تھا لیکن دولت مند ہونے کے ساتھ ساتھ بہت لالچی تھا۔ صابر کی کوئی اولاد نہ تھی تو اس کا چھوٹا بھائی خوش تھا۔ وہ سوچتا، صابر بوڑھا ہو رہا ہے۔ کچھ عرصے بعد جب صابر مر جائے گا تو اس کی کوٹھی، موٹر، دکان اور روپیہ سب کچھ میرے قبضے میں آ جائے گا لیکن اب اس کی خواہش مٹی میں مل گئی تھی۔ صابر کا چھوٹا بھائی رسم پوری کرنے کے لیے صابر کو مبارک باد دینے آیا۔ راستے میں اسے ایک اور بات سوچھی۔ اس نے سوچا کہ صابر کے ہاں تو لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ کوئی بات نہیں۔ میرا لڑکا پہلے سے ہے۔ اب وہ تین سال کا ہے۔ جب میرا لڑکا بڑا ہوگا تو صابر کی بیٹی بھی جوان ہو جائے گی۔ تب میں اپنے بیٹے کی شادی صابر کی بیٹی سے کر دوں گا اور صابر کی ساری دولت جہیز میں لے آؤں گا۔ اس طرح سب کچھ میرے قبضے میں آ جائے گا۔ میں بہت زیادہ امیر ہو جاؤں گا۔

خدا کی قدرت دیکھیے، صابر کی بیٹی پیدا ہونے کے چند روز بعد نصیب کا لڑکا پیدا ہوا۔ اب صابر اور اس کی بیوی اور بھی خوش ہوئے۔ انھوں نے اپنی نوکرانی کو بہت سی مبارک دی اور کہا۔ ”تمہارا لڑکا اور ہماری بیٹی ایک ساتھ پڑھیں گے اور اکٹھے کھیلیں گے۔“

یہ سن کر غریب نصیب خوشی سے پھولی نہ سائی۔ اس نے اپنے مالکوں اور ان کی ننھی بچی کو بہت سی دعائیں دیں۔ کچھ دن بعد صابر کی بچی کا نام فریدہ اور نصیب کے بیٹے کا نام طارق رکھا گیا۔ جب وہ دونوں کچھ بڑے ہوئے تو انھیں بہت اچھے سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ ادھر صابر کا چھوٹا بھائی بھی اسی انتظار میں تھا۔ اس نے بھی فوراً اپنے بیٹے کو اسی سکول اور اسی جماعت میں پڑھنے کے لیے بٹھا دیا۔ اس کے بیٹے کا نام جعفر تھا۔ طارق چھوٹی عمر ہی میں اپنی ماں کی خدمت کرنے لگا۔ وہ سکول سے فریدہ کے ساتھ واپس آتا لیکن کوٹھی میں نہ جاتا۔ اپنے مکان میں آ جاتا۔ اس کی ماں بھاگی آتی۔ بیٹے کو کھانا کھلاتی۔ طارق کھانے کے بعد ماں کی ٹانگیں اور سر دبانے لگتا۔ رات کو ماں کوٹھی میں کام ختم کر کے آتی تو طارق لیمپ کی روشنی میں پڑھ رہا ہوتا۔ جب وہ ماں کی خدمت کرنے سے فارغ ہوتا تو فریدہ کے ساتھ پڑھنے یا کھیلنے کے لیے کوٹھی میں چلا جاتا۔

طارق کی ماں اپنے ننھے بیٹے سے بہت خوش تھی۔ وہ اپنی جماعت میں سب سے اچھا لڑکا تھا۔ طارق کی استائیاں بھی اس سے خوش تھیں۔ وہ دل لگا کر پڑھتا تھا اسی لیے ہر امتحان میں اول آتا۔



طارق بولا۔ ”گھر میں امی میرا انتظار کرتی ہوں گی۔“  
 ”تھوڑی ہی دیر میں تو لوٹ آئیں گے۔“ فریدہ نے کہا۔ ”آؤ نا۔“ یہ کہتے ہوئے فریدہ نے طارق کا بازو پکڑ لیا۔  
 جعفر جھٹ بولا۔ ”لیکن فریدہ ہم تو اپنی موٹر میں جائیں گے۔ وہ سامنے میری کار کھڑی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے جعفر نے بڑی شان سے اپنی بھورے رنگ کی بڑی کار کی طرف اشارہ کیا۔

”تو کیا ہوا؟“ فریدہ بولی۔ ”طارق بھی ہمارے ساتھ بیٹھ جائے گا۔“  
 ”طارق اور میری گاڑی میں بیٹھے گا۔“ جعفر نے کہا۔  
 ”کیوں؟“ فریدہ نے حیران ہو کر سوال کیا۔

جعفر نے جواب دیا۔ ”دیکھو نا فریدہ! اس لڑکے کو ساتھ لے جانا ہماری شان کے خلاف ہے۔ ہم امیر ہیں۔“ فریدہ اس کی پوری بات سننے سے پہلے بولی۔ ”امیر اور غریب ہونے سے کیا ہوتا ہے، جعفر جو انسان اچھا ہے وہ اچھا ہے اور جو بُرا ہے وہ بُرا۔“

”اس کے کپڑے تو دیکھو۔“ جعفر نے طارق کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”اتنے میلے چیلے کپڑے ہیں۔ میری گاڑی خراب ہو جائے گی۔“  
 ”تو میں نہیں جاتی تمہارے ساتھ۔“ فریدہ نے ناراض ہو کر کہا۔  
 ”نہیں فریدہ تم چلی جاؤ۔“ طارق بولا۔ ”میں ویسے ہی نہیں جانا چاہتا۔“ یہ کہہ کر طارق سکول کے پھانک کے پاس رک گیا۔ پھر مڑ کر اپنے گھر کی طرف جانے لگا۔ فریدہ جلدی سے اس کے پیچھے گئی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اتنے میں جعفر بھی ان کے پیچھے آ گیا اور بولا۔ ”فریدہ، آؤ نا..... ڈرائیور کب سے انتظار کر رہا ہے۔“

فریدہ طارق کے بغیر جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ جعفر کو غصہ آ گیا۔ اس نے فریدہ سے تو کچھ نہیں کہا۔ ہاں طارق کو دھکا دے کر بولا۔  
 ”اپنے گھر جانا ہے تو جاؤ۔ نخرے کیوں کر رہے ہو؟ میں تو جا ہی رہا ہوں۔“ طارق نے فریدہ کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

”اچھا میں بھی نہیں جاتی۔“ یہ کہہ کر فریدہ طارق کے پیچھے چلنے لگی۔ جعفر نے فریدہ کا بازو پکڑ لیا اور اسے اپنی موٹر کی طرف کھینچنے لگا۔  
 ”میں نہیں جاؤں گی۔ میں نہیں جاؤں گی۔“ فریدہ چلائی۔

طارق نے جب دیکھا کہ جعفر فریدہ کو زبردستی لے جا رہا ہے تو وہ بولا۔ ”جعفر بھائی! وہ نہیں جانا چاہتی۔“

”مجھے بھائی مت کہو..... ذلیل چھو کرے۔“ جعفر غصے سے بولا۔  
 ”میں ذلیل ہوں؟“ طارق نے جعفر کے قریب آتے ہوئے کہا۔  
 ”تم ذلیل نہیں تو اور کیا ہو؟ دو ٹکے کے چھو کرے ہماری برابری

کرتے ہو۔“

”سب انسان برابر ہیں۔“ فریدہ بولی۔

”ہوں..... برابر ہیں۔“ جعفر نے بگڑ کر کہا۔ ”تم لوگوں نے ہی اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔“

”میرا دماغ تو ٹھیک ہے۔ تمہارا دماغ ٹھیک نہیں۔“ اب طارق بھی غصے سے بولا۔

اتنا سننا تھا کہ جعفر کے آگ لگ گئی۔ اس نے فریدہ کو چھوڑ دیا۔ بستہ سڑک پر پھینک دیا اور طارق کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ جعفر عمر میں طارق سے بڑا تھا اور موٹا تازہ بھی تھا۔ طارق غریب چھوٹا بھی تھا اور کمزور بھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔

”جعفر!“ فریدہ زور سے چلائی۔

”کینے، ذلیل بکواس کرتا ہے۔“ جعفر غصے سے گرجا۔ ”تیری ماں تو.....“ جعفر نے اتنا ہی کہا تھا کہ طارق کا خون دماغ کو چڑھ گیا۔ اس نے بھی اپنی کتابیں پھینک دیں اور جعفر پر ٹوٹ پڑا۔ کچھ اور بچے بھی سکول کے پھانک کے پاس کھڑے تھے۔ وہ طارق اور جعفر کی لڑائی کا تماشا دیکھنے لگے۔ کچھ دیر تک دونوں لڑتے رہے۔ تماشا دیکھنے والوں میں ایسے لڑکے بھی تھے جنہیں جعفر بہت تنگ کیا کرتا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اب جعفر سے بدلہ لینے کا اچھا موقع ہے۔ وہ سب جعفر سے لپٹ گئے۔

جعفر گھر پہنچا تو اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور منہ سو جا ہوا تھا۔ اس کے باپ نے جب اس سے پوچھا کہ کیا ہوا تو جعفر نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ زور زور سے رونے لگا۔

اس وقت دو آدمی اور جعفر کے گھر میں بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک شخص لمبا سا تھا۔ اس کے منہ پر چیچک کے داغ تھے۔ اس کا رنگ کالا تھا۔ اس نے دھوتی اور کرتا پہن رکھا تھا۔ دوسرا آدمی درمیانے قد کا اور کافی موٹا تھا۔ اس کے ایک کان میں ایک چھوٹی سی بالی تھی۔ دونوں جعفر کے بڑے مکان کے برآمدے میں موڑھوں پر بیٹھے تھے۔

موٹے آدمی نے برآمدے میں نظر دوڑائی پھر کالے آدمی سے کہا۔ ”ایک سگریٹ تو نکالو۔“  
 ”ہر وقت سگریٹ ہی نکالتا رہوں۔ کبھی تو اپنے سگریٹ بھی پیا کرو۔“ کالے نے جواب دیا۔ یہ سن کر موٹا ہنسنے لگا اور اس کے پیلے اور گندے دانت نظر آئے۔

”بس ایک ہی سگریٹ دے دو۔“ موٹا منت کرتے ہوئے بولا۔  
 ”آج سیٹھ سے مال ملے گا..... میں تمہیں پوری ڈبی لے دوں گا۔ ہاں!“





کالا آدمی بڑبڑانے لگا اور بڑبڑاتے ہوئے اپنی دھوتی کا پلو کھول کر سگریٹ کی ڈبیا سے دو سگریٹ نکالے۔ ایک سگریٹ موٹے کی طرف پھینک دیا اور دوسرا خود جلا لیا۔

موٹے آدمی نے سگریٹ کو دیکھا۔ سگریٹ مڑا مڑا ہوا تھا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ انگلیوں سے سگریٹ کو سیدھا کیا اور اپنی جیب سے ماچس نکال کر سگریٹ سلگایا اور لمبا کش لے کر دھواں برآمدے میں پھینک دیا۔ اتنے میں اندر کے کمرے سے جعفر کا باپ نکلا۔

دونوں آدمی اسے دیکھ کر موڑھوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں نے بڑھ کر جعفر کے باپ کو سلام کیا۔ جعفر کے باپ نے دونوں سے ہاتھ ملایا۔ دیوار کے پاس ایک آرام دہ کرسی پڑی تھی۔ جعفر کے باپ نے کرسی کھینچ کر ان کے پاس کر لی اور بیٹھ کر بولا۔

”میں نے تم کو ایک خاص کام کے لیے بلایا ہے۔“

”حکم کرو جی۔“ کالے نے فوراً کہا۔

”تم دونوں میرے خاص آدمی ہو۔ میں تمہیں اپنا یار بیلی سمجھتا ہوں۔“

”کیوں نہیں جی۔ بالکل جی۔“ موٹا آدمی بولا اور ہاتھ میں لیے ہوئے سگریٹ کا ایک اور لمبا کش لیا۔

”آپ حکم کریں جناب۔“ کالے نے کہا۔ ”ہم تو آپ کے ہاتھ باندھے غلام ہیں۔“

”بات یہ ہے کہ سانپ کے بچے کو پیدا ہوتے ہی مار دینا چاہیے۔“ جعفر کا باپ بولا۔

”سانپ کا بچہ تو کیا ہم اس کے باپ دادا کو بھی مار ڈالیں گے۔“ موٹے نے فوراً کہا۔ جعفر کے باپ نے اپنی کرسی گھسیٹ کر ان دونوں کے اور قریب کر لی۔ کرسی پر جھک کے آگے ہو گیا اور آہستہ سے بولا۔ ”بات یہ ہے کہ میرا بھائی صابر بڑا بے وقوف ہے۔

وہ ایک سانپ کے بچے کو دودھ پلا پلا کر پال رہا ہے۔“

”تو ہم آپ کے بھائی کا علاج کر لیتے ہیں۔“ موٹا بولا۔

”پوری بات تو سن لے۔“ کالے نے اپنے موٹے ساتھی کو ٹوک کر کہا۔ جعفر کا باپ ہنسنے لگا۔ پھر خاموش ہو گیا۔ اور کچھ سوچ کر بولا۔ ”میں تم کو خوش کر دوں گا۔ میرا یہ..... یہ بہت ضروری کام ہے۔ صرف سانپ کے بچے کو..... یہ کام جلد سے جلد ہونا چاہیے۔“

اس کے بعد جعفر کے باپ نے دونوں آدمیوں کو دس دس روپے کے نوٹوں کا بنڈل دکھایا۔ اتنے روپے دیکھ کر دونوں کے دل دھڑکنے لگے۔ موٹے نے تو ہاتھ سے سگریٹ کا ٹکڑا پھینک دیا اور دونوں ہاتھ نوٹوں کی طرف بڑھا دیے لیکن جعفر کے باپ نے نوٹ نہیں دیے۔ وہ بولا۔ ”یہ پچاس ہزار روپے ہیں..... یہ تمہارے ہیں۔ آج رات کو میرا کام کر کے اپنے نوٹ لے لینا۔“

”اچھا جی۔“ موٹا بولا۔

کالے آدمی نے موٹے کو غصے سے گھورا پھر جعفر کے باپ کی طرف منہ کر کے بولا۔ ”لیکن سیٹھ صاحب، مال تھوڑا ہے اور کام زیادہ۔“ ”اچھا مزید رقم بعد میں دے دوں گا۔“ جعفر کے باپ نے جواب دیا۔

دوپہر کو سکول کی چھٹی ہوئی۔ ہر روز کی طرح آج بھی فریدہ اور طارق سکول کے پھاٹک سے باہر نکلے۔ ان سے پہلے جعفر بھاگ کر اپنی موٹر میں آ بیٹھا تھا۔ موٹر میں موٹا آدمی اور کالا آدمی پہلے سے بیٹھے



تھے۔ جب فریدہ اور طارق باہر آئے تو جعفر نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے کالے آدمی سے کہا۔

”دیکھ، وہ ہے طارق۔ وہ پتلا سا لڑکا۔ جس نے دھاری دار قمیص اور پاجامہ پہنا ہوا ہے۔“

”ہاں تو یہ ہے سانپ کا بچہ۔“ موٹے نے آہستہ سے کہا۔

”بس ہو گیا.....“ کالا آدمی بولا۔ ”اب چلو۔“ موٹر چل پڑی۔

رات کو طارق اپنے چھوٹے سے کوارٹر میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ باہر کا دروازہ کھلا اور اس کی ماں اندر آئی۔ ماں دن بھر کوٹھی میں کام کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے کھانا بھی لائی تھی۔ صابر کی بیوی ہر روز رات کو کافی کھانا دے دیا کرتی تھی۔ طارق کتابیں رکھ کر جلدی سے اٹھا اور ماں سے کہنے لگا۔

”ماں، آپ بیٹھ جائیں۔ میں آپ کے ہاتھ دھلا دیتا ہوں۔“

طارق لوٹے میں پانی لے آیا۔ ماں ہاتھ دھونے لگی، اتنے میں طارق کھانا ڈالنے کے لیے برتن لے آیا اور ایک جگہ میں پانی۔ دونوں ماں بیٹا بیٹھ کر کھانے لگے۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو طارق نے ماں کے ہاتھ دھوائے، ماں تھکی ہوئی تھی۔ چارپائی پر لیٹ گئی۔ طارق ماں کے پاس بیٹھ کر اس کی ٹانگیں دبائے لگا۔

”بس بیٹا بس۔ اب تم پڑھو۔“

”پڑھ لوں گا۔ ساری رات پڑی ہے پڑھنے کے لیے۔“ طارق بولا۔ ”ابھی تو آپ کا سر دبانا ہے۔“

”نہیں بیٹا! میں تھکی ہوئی نہیں ہوں۔“

”تھکی ہوئی نہیں ہو؟“ طارق بولا۔ ”آپ دن بھر کام کرتی ہیں۔ اس قدر تھک جاتی ہیں۔“

”تم بھی دن بھر پڑھتے پڑھتے تھک جاتے ہو، میرے لال۔“

”میں بالکل نہیں تھکتا ماں۔ واہ! آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں۔“

اب طارق ماں کا سر دبائے لگا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

طارق ماں کی چارپائی سے اٹھ کر دروازے پر گیا۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک اندھا کھڑا ہے۔ وہ بولا۔

”میں پردیسی ہوں بابا۔ اندھا محتاج ہوں۔ راستہ بھول گیا ہوں۔ مجھے سڑک پر پہنچا دو۔“

”کون ہے طارق؟“ ماں نے اندر سے پوچھا۔

”ماں ایک پردیسی ہے۔ بے چارہ اندھا ہے۔ کہتا ہے سڑک

تک پہنچا دو۔“

”جاؤ! اسے چھوڑ آؤ۔“ ماں نے کہا۔

طارق نے باہر آ کر اندھے کی لاٹھی پکڑ لی اور اسے سڑک کی طرف لے چلا۔ جب وہ ایک جگہ اندھیرے میں پہنچے تو اچانک ایک اور آدمی پیچھے سے آیا اور اس نے طارق کے دونوں بازو پکڑ لیے۔ اندھے نے آنکھیں کھول دیں اور جیب سے ایک رومال نکال کر طارق کے منہ میں ٹھونس دیا۔ پیچھے سے موٹے آدمی نے اس کے ہاتھ باندھے پھر پاؤں۔ اس کے بعد دونوں آدمیوں نے اٹھا کر اسے پاس کھڑی ہوئی موٹر میں ڈال دیا اور موٹر چل پڑی۔

موٹر بڑی تیز رفتاری کے ساتھ بھاگی جا رہی تھی۔ اس کے اندر پچھلی سیٹ پر طارق پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے اور منہ میں رومال ٹھسا ہوا تھا۔ اب طارق نہ تو بول سکتا تھا اور نہ ہی سکتا تھا۔ طارق کے پاس موٹا آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے ایک کان میں سونے کی چھوٹی سی بالی تھی۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ لمبا کالا آدمی بیٹھا تھا۔ وہ سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور مڑ مڑ کے بندھے ہوئے طارق کو دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو کچھ دیر پہلے اندھا بن کر طارق کے گھر پر آیا تھا اور طارق سے راستہ دکھانے کے لیے کہا تھا۔

طارق کا دل ڈر کے مارے دھڑک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ لوگ کون ہیں اور اسے کہاں لیے جا رہے ہیں؟ اس نے بولنے اور ہلنے جلنے کی بہت کوشش کی لیکن یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ موٹے نے کالے آدمی سے سگریٹ مانگا۔ کالے کو پہلے تو غصہ آیا کہ موٹا ہر وقت اس سے سگریٹ مانگ کر پیتا ہے۔ اپنے سگریٹ نہیں خریدتا لیکن وہ غصہ پی گیا۔ کالے نے دل میں سوچا کہ یہ موقع غصہ ظاہر کرنے کا نہیں۔ موٹا دو تین سگریٹ اور پی لے گا تو کیا فرق پڑے گا۔ ابھی ہم پچھلی سیٹ پر پڑے ہوئے لڑکے کو ٹھکانے لگا کر واپس جائیں گے۔ جعفر کا باپ ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔ وہاں جاتے ہی جعفر کا باپ ہمیں مزید رقم دے گا۔ پھر ہم عیش کریں گے۔ یہ سوچ کر کالے آدمی نے پھر مڑ کر طارق کو گھورا۔ طارق اس وقت سیٹ پر زور لگا کر ہلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کالے آدمی کو بہت غصہ آیا۔ اس نے کڑک کے موٹے آدمی سے کہا۔ ”ابے، تو سو رہا ہے کیا؟“

”میں تو جاگ رہا ہوں۔ دیکھ لو میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔“

”آہستہ بولو۔“ موٹر چلاتے ہوئے ڈرائیور نے مڑ کر موٹے

سے کہا۔ اور پھر سامنے سڑک پر دیکھنے لگا۔ کالے آدمی نے طارق کی

طرف اشارہ کیا۔ موٹے نے بھی طارق کو دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ طارق

اپنی جگہ سے کھسک رہا ہے۔ موٹے نے فوراً اپنی جیب سے ایک

تیز دھار چاقو نکالا۔ اسے کھول کر طارق کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔



پھر بولا۔

”خبردار! اگر ملنے کی کوشش کی تو..... ہاں یاد رکھو میرا نام.....“

”بک بک مت کر۔“ کالے نے موٹے کو ڈانٹ دیا۔ پھر

ڈرائیور کی طرف منہ کر کے بولا۔ ”دیکھو جی، اسے اپنا نام بتا رہا ہے۔“

کار شہر سے باہر پہنچ چکی تھی۔ اس کی رفتار کچھ آہستہ ہوئی۔ پھر

ایک کچے راستے پر چلنے لگی۔ کار کے پیچھے مٹی اڑ رہی تھی۔ شہر کے

ساتھ اس کی روشنیاں بھی دور ہوتی جا رہی تھیں۔ آگے کافی اندھیرا

تھا۔ سوائے کار کی روشنی کے اور کوئی روشنی نہ تھی۔ کار کچھ اور آہستہ ہو

گئی۔ پھر ایک ویران جگہ پر رُک گئی۔ اب یہاں مکمل اندھیرا تھا۔

پہلے کالا آدمی کار سے باہر نکلا۔ پھر اس نے پیچھے کا دروازہ

کھولا۔ موٹا باہر نکلا۔ موٹے نے ہاتھ بڑھا کر طارق کو گھسیٹا اور اسے

بھی باہر نکال لیا۔ اب طارق دونوں آدمیوں کے پاؤں کے پاس،

نیچے مٹی میں پڑا تھا۔ کار تھوڑی سی آگے گئی، مڑی اور پھر تیزی سے

واپس بھاگ گئی۔

موٹا کار کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا، پھر کالے آدمی سے کہنے لگا۔

”ہم واپس کیسے جائیں گے؟“

”چلے جائیں گے۔“ کالے نے جواب دیا۔

”اتنا اندھیرا ہے..... اور ہم شہر سے بہت دور آگئے ہیں۔“ موٹا

گھبرا کر بولا۔

”مرا کیوں جاتا ہے..... پہلے اپنا کام تو کر..... پھر واپس جانے

کی سوچنا۔“ کالے نے اسے ڈانٹا۔ پھر اسے کچھ یاد آ گیا۔ اس نے

جیب سے ڈیبا نکال کر ایک سگریٹ موٹے کی طرف بڑھایا اور بولا۔

”چلو یا ر جلدی سے یہ کام ختم کر دیں۔“ یہ کہتے ہوئے موٹے

نے نیچے پڑے ہوئے طارق کی طرف اشارہ کیا۔ کالے نے اپنے

سامنے دیکھا۔ قریب ہی ایک پہاڑی تھی۔ اس نے اپنی تسلی کرنے

کے لیے موٹے سے کہا۔ ”تم یہیں کھڑے رہو..... میں ابھی آتا

ہوں۔“ یہ کہہ کر کالا آدمی پہاڑی کی طرف چلا گیا۔

موٹا زیادہ دیر تک کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ طارق کے پاس بیٹھ

گیا۔ اس وقت پہاڑی کے اوپر چاند نکل رہا تھا۔ موٹا پہاڑی کی طرف

دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ اس کا ساتھی پہاڑی

کی طرف کیوں گیا ہے۔ موٹا، کالے آدمی کے واپس آنے کا منتظر تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ جلدی سے اپنا کام ختم کر کے واپس جائے۔ جعفر کے

باپ سے روپے لے اور اپنے گھر چلا جائے۔ موٹے نے پہاڑی کی

طرف دیکھا تو اس کی نظر چاند پر پڑی۔

”اوہو، یہ تو بُرا ہوا۔“ موٹے نے سوچا۔ چاند نکل رہا ہے۔

روشنی ہو رہی ہے۔ اگر کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو ہم پکڑے جائیں

گے..... اور پکڑے گئے تو.....“ یہ سوچ کر موٹے نے بندھے ہوئے

طارق کی طرف دیکھا۔

”یہ کیا مصیبت گلے پڑ گئی ہے۔“ موٹا طارق کے چہرے کو

دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

”سانپ کا بچہ.....“ موٹا سگریٹ کا لمبا کش لے کر بولا۔ اس

وقت موٹے کی نظریں طارق کی آنکھوں پر گئیں۔ طارق کی نظریں

موٹے پر لگی تھیں۔ موٹے نے دل میں کہا۔

”کیا یہ سانپ کی آنکھیں ہیں؟“

”نہیں.....“ موٹے نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دیا اور اس

وقت موٹے کی نظروں کے سامنے اپنے بیٹے کی آنکھیں آ گئیں۔

موٹے کو یوں لگا جیسے طارق کی آنکھیں، اس کے بیٹے جیسی ہیں۔

موٹے کا بیٹا پچھلے سال اس سے ناراض ہو کر گھر سے بھاگ گیا تھا۔

یہ خیال آتے ہی موٹے کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے اس خیال

کو دل سے نکالنے کے لیے زور زور سے سگریٹ پیا لیکن یہ خیال دل

سے نہ نکلا۔ موٹا اٹھ کھڑا ہوا اور آدھے سے زیادہ سگریٹ پھینک دیا۔

سامنے سے لمبا آدمی واپس آ رہا تھا۔

لمبا، کالا آدمی پہاڑی کی طرف سے آ کر موٹے کے پاس رک

گیا۔ اس نے پہلے مٹی پر پڑے ہوئے طارق کو اور پھر مڑ کر چاروں

طرف دیکھا اور بولا۔ ”جلدی کرو، چاند نکل رہا ہے۔“

”کیا کروں؟“ موٹے نے پوچھا۔

”اس کو اٹھا کر لے آؤ..... میں نے جگہ دیکھ لی ہے۔“ کالے

نے پہاڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”وہاں بڑی اچھی جگہ ہے۔

اسے ختم کر کے دوسری طرف پانی میں پھینک دیں گے۔ چلو اٹھاؤ۔“

یہ کہہ کر کالا آدمی خود چلنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ موٹا طارق کو اٹھا

کر اس کے پیچھے چلا آئے گا لیکن موٹا ویسے ہی کھڑا رہا۔

”اٹھاؤ نا اسے۔“ کالے نے غصے سے کہا۔

”کیا کروں؟“ موٹے نے پھر سوال کیا۔

”کیا کروں، کیا کروں کی رٹ لگا رکھی ہے۔“ کالے کو اور زیادہ

غصہ آ گیا۔ ”تمہیں کیا ہو گیا؟“

موٹا چپ رہا۔ کالے نے فوراً جیب سے سگریٹ نکال کر موٹے

کی طرف بڑھایا۔

”لو سگریٹ پیو۔“ اس نے موٹے سے کہا لیکن موٹے نے نہیں لیا۔



”اسے چھوڑ دے۔“ موٹا بولا لیکن کالے نے اس کی بات نہیں سنی۔ وہ طارق کو اٹھا کر چلنے لگا۔

”اینوں چھڑ دے..... اوئے چھڑ دے.....“ موٹا غصے سے گرجا۔ کالا طارق کو اٹھائے پہاڑی کی طرف جا رہا تھا۔

”میں کہتا ہوں..... چھڑ دے.....“ یہ کہتے ہوئے موٹے نے چھرا نکالا اور کالے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر کالے نے طارق کو زمین پر پھینک دیا۔ کالے نے دانت نکالے اور بولا۔

”مجھ پر ہاتھ اٹھائے گا..... اپنے یار کا خون کرے گا؟“ موٹے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”اپنے ساتھ تو مجھے بھی پکڑوا دے گا۔“ کالا بولا۔ پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”اچھا چل اسے اوپر لے چلتے ہیں کیوں کہ یہاں خطرہ ہے۔ اوپر سے اس کے ہاتھ پاؤں کھول کر اسے بھگا دیں گے۔“ یہ سن کر موٹے نے جلدی سے طارق کو اٹھا لیا اور کالے کے ساتھ ساتھ پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ چاند کافی اوپر آ گیا تھا۔ موٹا طارق کو دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھیں..... اور موٹا بولا۔

”یار اس کی آنکھیں بالکل میرے بیٹے جیسی ہیں۔“ پھر طارق سے کہنے لگا۔ ”بیٹے! میں تمہیں نہیں مرنے دوں گا۔“

وہ پہاڑی پر پہنچے۔ موٹے کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ کالے نے کہا۔ ”اسے نیچے رکھ دے اور مجھے چھرا دے۔ میں اس کی رسیاں کاٹ دوں گا۔“

”میں خود کاٹوں گا۔“ موٹے نے کہا اور چھرا نکال کر طارق کی رسیاں کاٹنے کے لیے جھکا۔ کالے نے موٹے کو زور سے لات ماری۔ اس کے ہاتھ سے چھرا گر گیا۔ کالے نے لپک کر چھرا اٹھا لیا اور چھرا موٹے کی طرف کر کے بولا۔ ”خبردار..... ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا ورنہ تیرا پیٹ پھاڑ دوں گا۔“

یہ کہہ کر کالا جلدی سے طارق کی طرف بڑھا۔ موٹا آگے آ گیا اور کالے سے چھرا چھیننے لگا۔ کالے نے اسے زور سے گھونسا مارا۔ موٹے نے وہاں پڑا ہوا ایک پتھر اٹھا لیا اور کالے کو دے مارا۔ کالے کی کپٹی سے خون بہہ نکلا۔ وہ پاگلوں کی طرح چھراتا نے موٹے کی طرف آیا۔ نیچے پڑا ہوا طارق خود کو رسیوں سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ زور لگا لگا کر ادھر ادھر ہو رہا تھا۔ وہ سرکتے سرکتے لڑتے ہوئے آدمیوں سے کچھ دور چلا گیا۔ اچانک اسے معلوم ہوا کہ پہاڑی ختم ہو گئی ہے۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن سنبھل نہ سکا۔ وہ لڑھکنیاں کھاتا ہوا پہاڑی سے نیچے گر گیا۔ (باقی آئندہ)

”سگریٹ پیو۔“ کالے آدمی نے موٹے کے قریب آتے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں پیتا۔“ موٹا بولا۔

یہ سن کر کالا حیران رہ گیا۔ اسے حیرانی اس بات پر تھی کہ موٹے نے آج پہلی بار سگریٹ لینے سے انکار کر دیا تھا لیکن وہ زیادہ حیران اس لیے تھا کہ موٹے کی آواز بدلی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر کالے کے ہاتھ سے سگریٹ گر پڑا۔ وہ اور قریب آیا اور موٹے کا بازو پکڑ کر اسے کھینچا اور بولا۔ ”الو کے پٹھے، کیا ہوا ہے تجھے۔“

”مجھے..... مجھے..... کچھ نہیں ہوا۔“

”چل جلدی کر.....“ کالا بولا۔ یہاں ایک ایک منٹ کا خطرہ ہے اور توبت بنا کھڑا ہے۔

”ہم پکڑے جائیں گے۔“ موٹا بولا۔

”کیوں؟“ کالے نے پوچھا۔

”اس غریب لڑکے کو ماریں گے تو.....“

”امام دین.....“ کالے نے چلا کر کہا..... تو ڈر پوک ہے یا پھر پاگل ہو گیا ہے۔“

”میں پاگل نہیں ہوا..... ہاں ڈرتا ہوں..... خدا سے.....“

”ہوش کر..... امام دین، ہوش کر۔“ کالے آدمی نے موٹے کے دونوں بازو پکڑ کر اسے زور سے ہلایا اور بولا۔

”وقت کم ہے، بہت کم ہے..... دیکھ میری بات سن.....“ کالے آدمی نے موٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ اب اگر ہم اسے نہیں ماریں گے تو یہ ہمیں پکڑوا دے گا۔ ہمیں اسے مارنا پڑے گا۔ روپے کے لیے ہی نہیں، اپنی جان کے لیے بھی۔“

”میں اسے نہیں ماروں گا۔“ موٹے نے کہا۔

”تو چھرا مجھے دے۔ میں اسے مار ڈالوں گا اور پھر اسے پہاڑی پر سے نیچے پھینک دوں گا۔ چل اٹھا اسے۔“

”تم اسے نہیں مارو گے۔“ موٹا آدمی بولا۔

”کیوں؟“ کالے نے غصے سے کہا۔

”میں تمہیں چھرا نہیں دوں گا اور اسے.....“ یہ سن کر کالا آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے زور سے تھپڑ موٹے کے منہ پر مارا۔ موٹا ویسے ہی کھڑا رہا اور بولا۔ ”پاگل..... کیوں یتیم کا خون کرتا ہے۔ یہ ہماری طرح غریب ہے۔ جعفر کا باپ امیر ہے۔ امیر لوگ دولت کے لالچ میں خون کرتے ہیں۔ ہم کیوں.....“

”بکواس مت کر..... کمینے، ڈر پوک!“ یہ کہہ کر کالا آدمی جھکا اور خود ہی بندھے ہوئے طارق کو اٹھانے لگا۔



سنہرے لوگ



# ڈاکٹر عبدالقدیر خان

غلام حسین میمن

وہ آج تک اس واقعے کو نہیں بھولتے۔

یکم اپریل 1936ء کو بھوپال میں ایک استاد کے گھر پیدا ہونے والے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے لیے وہ دور علم و ادب کی قدر دانی کا دور تھا۔ بھوپال کے نواب علی گڑھ یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ تھے اور بعد میں وہ اس درس گاہ کے وائس چانسلر بھی مقرر ہوئے۔ سر راس مسعود بھی وہاں کے وزیر تعلیم تھے جو علامہ اقبال کے دوست تھے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر نے میٹرک تک تعلیم بھوپال میں ہی امتیازی حیثیت سے حاصل کی۔

انہیں بچپن میں ہاکی کھیلنے اور پتنگ اڑانے کا شوق رہا۔ مچھلی کا شکار اور تیراکی بھی ان کے محبوب مشغلے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ مطالعے کا بھی انہیں بے حد شوق تھا۔ اس عمر میں جب نوجوان کھیل کود میں مصروف رہتے ہیں، انہوں نے مولانا شبلی نعمانی کی ”الفاروق“ ایک سے زائد مرتبہ پڑھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا

14 اگست 1947ء کی رات 12 بجے پاکستان کے قیام کا

اعلان ہوا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کے محلوں اور گھروں پر ہتھیاروں سے لیس ہو کر حملے کرنے شروع کر دیئے اور نہتے (بغیر اسلحے کے) مسلمانوں کو گاجر مولیٰ کی طرح کاٹتے رہے۔ مسلمانوں نے اپنی جان اور املاک (ملکیت کی جمع) کو بچانے کے لیے پاکستان کی جانب ہجرت کرنا شروع کیا۔ اسے انسانی تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت سمجھی جاتی ہے۔ راستے میں مسلمانوں سے مال و اسباب لوٹا گیا اور زندگی کی سانسیں بھی چھینی گئیں۔ کچھ کو احتجاج کے جواب میں گالیاں اور لائیں کھانے کو ملیں۔ کچھ خوش قسمت قافلے لٹتے لٹاتے زندہ پاکستان پہنچنے میں کام یاب ہو گئے۔ ان میں ایک نوجوان عبدالقدیر خان بھی تھا جس سے اس کے مطالعے کی کتابیں چھین کر ذلیل کیا گیا۔ آج ہم انہیں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے نام سے جانتے ہیں۔



عبدالحلیم شرر اور نسیم حجازی بھی ان کے پسندیدہ ناول نگار رہے۔ نسیم حجازی کے ناول ”یوسف بن تاشفین“ اور ”محمد بن قاسم“ کو انہوں نے بار بار پڑھا۔

پاکستان آنے کے بعد ان کی رہائش رام سواری محلے میں رہی۔ 1954ء میں انہوں نے ڈی جے سائنس کالج میں داخلہ لیا۔ فزکس ان کا پسندیدہ مضمون تھا۔ وہ اپنا اکثر وقت مطالعے میں گزارتے۔ شعر و شاعری سے بھی دل چسپی رہی۔ وہ اکثر اپنے پسندیدہ اشعار ایک ڈائری میں لکھ لیتے تھے۔ ان کے آئیڈیل قائد اعظم محمد علی جناح ہیں۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے ہندوؤں کے ظالمانہ سلوک کو کبھی نہ بھولے۔ اسی وجہ سے ان کی خواہش تھی کہ پاکستان مضبوط اور مستحکم ہو۔

1957ء میں انہوں نے بی ایس سی کیا۔ کچھ عرصہ ملازمت کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر چلے گئے۔ ہالینڈ کی مشہور ٹیکنیکل یونیورسٹی ”ڈیلٹ“ سے ایم ایس سی کیا۔ دورانِ تعلیم ہی وہ ایک غیر ملکی خاتون بینی سے شادی کر چکے تھے جو ان کی بہترین رفیق ثابت ہوئی۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ پاکستان میں رہ کر ملک کی خدمت کریں مگر یہ ان کے لیے ممکن نہ ہوا۔

ان ہی دنوں ایک اور واقعہ ہوا جسے پوری قوم کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عبدالقدیر خان بھی بھول نہ سکے۔ 16 دسمبر 1971ء کو پاکستان کا ایک بازو مشرقی پاکستان علیحدہ ہو گیا اور بنگلہ دیش بن گیا۔ ٹیلی ویژن اسکرین پر بنگلہ دیش بننے کی خبر اور پاک فوج کے جنرل نیازی کا اپنے ہزاروں فوجیوں کے ساتھ بھارت کے جنرل اڑوڑا کے سامنے ہتھیار ڈالنا، پاک فوج کے جنرل نیازی کے سینے سے بیجز نوچنا جیسے لمحات کسی کے لیے بھولنے والے نہیں ہیں۔ یہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے لیے دوسرا دھچکا تھا۔

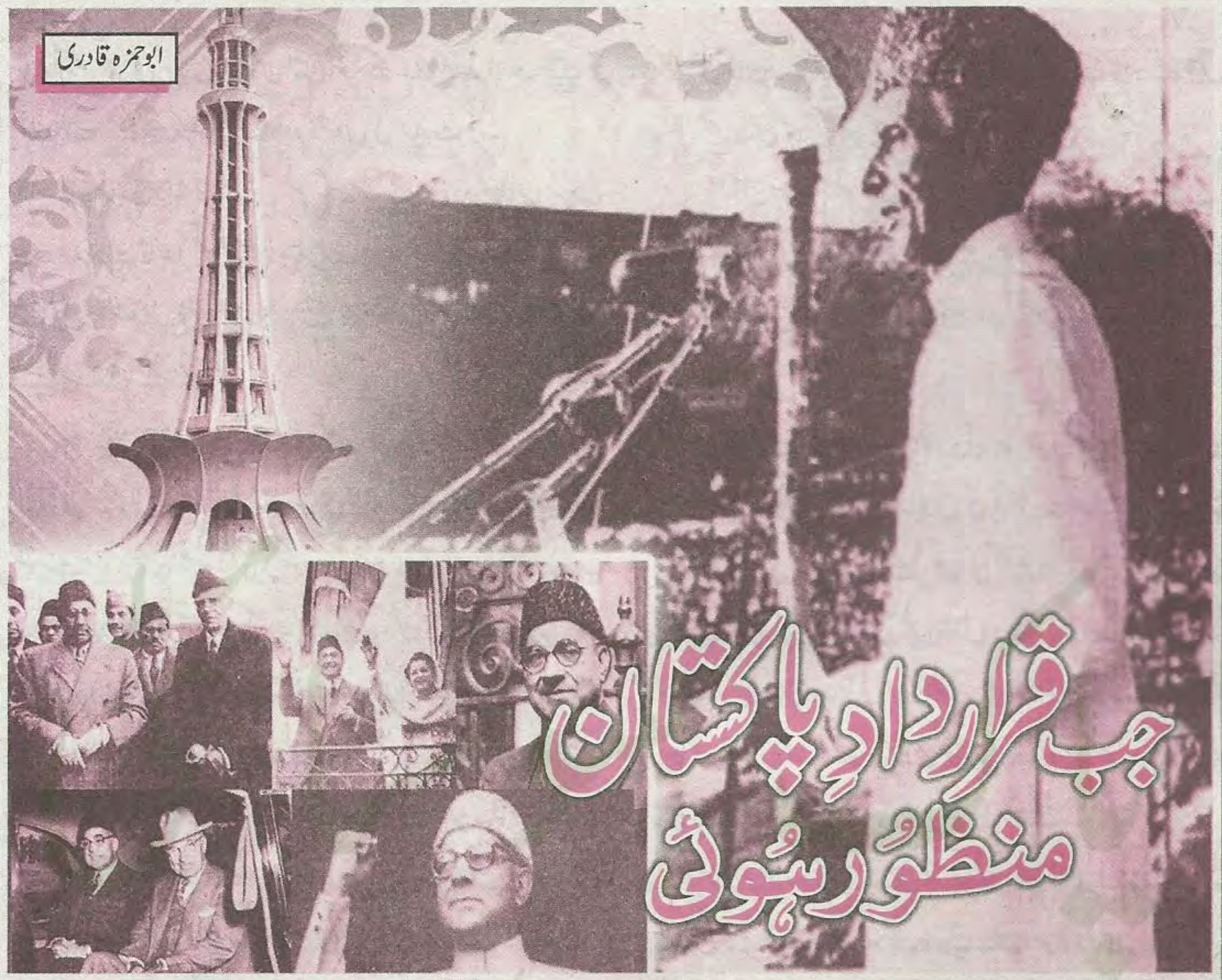
اس دوران ایمسٹرڈم، ہالینڈ سے منسلک ہو کر اس کے لیے اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔ انجینئرنگ کی یہ خصوصی مشاورتی فرم ریلوے انجنوں، ہوائی سرنگوں، بحری جہازوں سمیت الٹرا سینٹری فیوجز میں خصوصی مہارت رکھتی تھی۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان دسمبر 1975ء میں تعطیلات پر پاکستان آئے تو ان کی خواہش ہوئی کہ وہ

پاکستان کے لیے کچھ کریں۔ انہوں نے پاکستان کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو سے رابطہ کیا اور خط لکھ کر بتایا کہ میں نے میٹالرجی میں ڈاکٹریٹ ہی نہیں کیا تھا بلکہ اس موضوع پر لاتعداد تحقیقی مضامین کے علاوہ ایک کتاب بھی لکھ چکا ہوں۔ میں یورینیم کی افزودگی جیسے پیچیدہ اور مشکل ترین کام میں بھی مہارت رکھتا ہوں اور ہالینڈ میں ایسے ہی ایک منصوبے کا حصہ ہوں جس کا مقصد سینٹری فیوج سسٹم کے ذریعے یورینیم کی افزودگی ہے کیوں کہ اس کے ذریعے سے کم خرچ میں ایٹمی توانائی کا حصول ممکن ہے اور اسی طریقے کو بروئے کار لا کر بہت تھوڑے عرصے میں پاکستان کو بھی ایٹمی طاقت بنایا جاسکتا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو خود اس معاملے میں بے حد جذباتی تھے کیوں کہ 18 مئی 1974ء کو بھارت نے ایٹمی دھماکہ کر کے خطے میں اپنی برتری ثابت کر دی تھی۔ 1971ء پاکستان کے ٹوٹنے اور مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے میں بھارت کا ہاتھ تھا جب کہ پاکستان ایٹمی طاقت میں صفر تھا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی یہ پیش کش پاکستان کو مضبوط بنانے کے لیے بہترین تھی جسے ذوالفقار علی بھٹو نے فوراً قبول کیا اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے یہ کام شروع کر دیا۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی سربراہی میں وہ کام ہو ہی گیا جو غیروں کے ساتھ ساتھ اپنوں کے لیے بھی حیران کن تھا۔ پاکستان ایٹمی طاقت بن چکا تھا مگر اسے ابھی تک اس کے اظہار یا ایٹمی دھماکے کرنے کا موقع نہیں مل پارہا تھا۔

پھر ایک روز یہ موقع بھی بھارت نے فراہم کر دیا۔ مئی 1998ء میں اس نے ایک بار پھر ایٹمی دھماکہ کر کے خطے میں طاقت کے توازن کو بگاڑنے کی کوشش کی۔ پاکستان نے اس کا بھرپور جواب دیا اور 28 مئی 1998ء کو چاغی (بلوچستان) کے مقام پر دھماکہ کر کے اسلامی دنیا کا پہلا ایٹمی ملک بن گیا۔ اس ساری کامیابی کے پیچھے یقیناً ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ان کے ساتھیوں کی شبانہ روز کاوشوں کا دخل تھا۔ اس دن کو ”یوم تکبیر“ کے نام سے اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو اس کارنامے کے بعد ”محسن پاکستان“ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ آج کل ایک اخبار میں ہفتہ وار کالم لکھتے ہیں۔ ☆☆





ابو حمزہ قادری

## جب قرارداد پاکستان منظور ہوئی

چھوڑی۔ کانگریس کے ظلم کا سورج 1939ء کے آخر میں ڈوبا۔ اس سیاہ رات کے ختم ہونے پر قائد اعظم محمد علی جناح کی اپیل پر ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے یوم نجات منایا۔

یہ وہ واقعات تھے جنہوں نے مسلمانان ہند اور ان کے مخلص رہ نماؤں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ 1906ء میں قائم ہونے والی مسلمانوں کی تنظیم ”آل انڈیا مسلم لیگ“ کے 27 ویں سالانہ اجلاس کی تیاریاں ہونے لگیں۔ یہ اجلاس لاہور میں ہونا طے پایا اور اس کے لیے 22 تا 24 مارچ 1940ء کی تاریخیں مقرر ہوئیں۔

قائد اعظم محمد علی جناح حکومتی ارکان پر پہلے ہی واضح کر چکے تھے کہ مسلم لیگی اس اجلاس میں ایک علیحدہ ریاست کا مطالبہ کرے گی۔ اس لیے اجلاس کو روکنے کی کافی کوشش کی گئی مگر خدا کو منظور تھا کہ یہ اجلاس اپنے وقت پر ہو کر ہی رہا۔ اس دوران علامہ عنایت اللہ مشرقی کی ”خاکسار تحریک“ کے ساتھ لاہور میں حادثہ رونما ہوا۔

مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ 1916ء کے لکھنؤ اجلاس میں قائد اعظم محمد علی جناح نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایک بھرپور کوشش کی تھی تاکہ ملک میں کسی قسم کی بد امنی نہ رہے اور ملک میں حکومت برطانیہ کے راج کو کم سے کم کیا جائے، مگر ہندوؤں کی ہٹ دھرمی اور وعدہ خلافی نے کانگریس کا پول کھول دیا اور معاہدہ لکھنؤ ختم ہو گیا۔ یہ قائد اعظم کی مسلمانوں کی طرف سے آخری کوشش تھی۔ اس سے قبل 1876ء میں بنارس میں ہندوؤں کی جانب سے عربی اور فارسی کی جگہ دیوناگری اور ہندی کو سرکاری زبان بنانے کی مہم نے سرسید احمد خان کو بھی دو قومی نظریہ کا حامل بنا دیا تھا۔ 1890ء میں مشہور ناول نگار اور صحافی عبدالحلیم شرر نے پہلی بار تقسیم ہند کا حل پیش کیا تھا۔

متحدہ ہندوستان میں انتخابات کے بعد 1937ء میں کانگریس کو اقتدار ملا تو یہاں بھی ہندوؤں نے انتہا کر دی۔ مسلمانوں کے لیے ترقی کے ہر راستے بند کر کے انہیں ہندو بنانے میں کوئی کسر نہ



قائد اعظم محمد علی جناح اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور پہنچے تو سب سے پہلے میوہسپتال گئے اور زخمیوں کی عیادت کی۔

22 مارچ 1940ء کو مسلم لیگ کا تین روزہ اجلاس شروع ہوا۔ صدارت قائد اعظم محمد علی جناح نے کی۔ نواب شاہنواز ممدوٹ نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ اس کے بعد قائد اعظم محمد علی جناح نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا:

”ہندوستان کا مسئلہ فرقہ وارانہ نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ اس لیے اس مسئلے کو بین الاقوامی مان کر ہی حل کرنا چاہیے۔ اگر برطانوی حکومت ہندوستان میں امن و سکون چاہتی ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے جداگانہ قومی وطن قائم کیے جائیں۔ ہندو اور مسلمان کبھی ایک قوم نہیں بن سکتے۔ نہ دونوں کے درمیان شادیاں ہوتی ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ دونوں کی تہذیبیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اکثر اوقات ایک کا ہیرو دوسرے کا دشمن ہوتا ہے۔ ایک کی فتح دوسرے کی شکست ہوتی ہے۔ ایسی متضاد قوموں کو ایک ایسے نظام کا حصہ بنانا جس میں ایک اقلیت اور دوسری اکثریت ہو، اس کا نتیجہ صرف یہ ہو گا کہ ان میں بے چینی بڑھے گی اور ایسا نظام بالآخر تباہ و برباد ہو جائے گا۔ مسلمان ایک اقلیت نہیں بلکہ وہ قومیت کی ہر تعریف کی رو سے ایک قوم ہیں لہذا ان کا علیحدہ وطن ہونا چاہیے۔“

اسی دوران قائد اعظم محمد علی جناح نے ہندو رہ نما لالہ لاجپت رائے کا 1926ء میں سی آر داس کو لکھے گئے خط کا بھی حوالہ دیا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ مسلمان اور ہندو دو مختلف قومیں ہیں جنہیں ایک کر کے قوم بنانا ناممکن ہے۔ اس خط کے متن نے وہاں موجود حاضرین کو حیران کر دیا۔

اگلا دن اجلاس کا دوسرا دن، 23 مارچ 1940ء کا تھا۔ اس دن برصغیر کے مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا۔ مسلم لیگ کے اس اہم اجلاس کے دوسرے دن چار سو الفاظ اور چار مختصر پیرا گراف پر مشتمل ایک قرار داد انگریزی میں شیر بنگال مولوی ابوالقاسم فضل الحق نے پیش کی جس کا فی البدیہہ اردو ترجمہ مولانا

ظفر علی خان نے کیا۔ یہ قرار داد، قرار داد لاہور کے نام سے پیش کی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ:

”آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی مسلمہ رائے ہے کہ کوئی بھی آئینی منصوبہ اس ملک میں قابل عمل اور مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہو گا جب تک مندرجہ ذیل تجاویز پر عمل نہ کیا جائے گا۔

جغرافیائی طور پر تمام علاقوں کی حد بندی ایسے خطوں میں کی جائے جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے مثلاً ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی حصے، ان کی تشکیل ایسی آزاد ریاستوں کی صورت میں کی جائے جن میں شامل وحدتیں خود مختار اور اقتدار کی حامل ہوں۔ ان وحدتوں اور خطوں میں اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، معاشی، سیاسی اور انتظامی حقوق و مفادات کا مناسب و موثر تحفظ ان کے مشورے سے آئین میں پیش کیا جائے۔“

اس قرار داد کی تائید میں اتر پردیش (یوپی) سے چوہدری خلیق الزمان نے کی۔ سردار اورنگ زیب خان، سر عبداللہ ہارون، نواب اسماعیل خان، قاضی محمد عیسیٰ، بیگم مولانا محمد علی جوہر، ابراہیم اسماعیل چندریگر (آئی آئی چندریگر، جو بعد میں پاکستان کے وزیر اعظم بنے) مولانا عبدالحامد بدایونی اور دوسرے مسلم اکابرین نے مدلل تقاریر کیں۔

اس قرار داد لاہور میں اور تائید کے دوران تقاریر میں کہیں بھی پاکستان کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ اس قرار داد کو محض تقسیم ہند کی قرار داد کہا گیا، البتہ محترمہ امجدی بیگم (بیگم مولانا محمد علی جوہر) نے اپنی تقریر میں اس کو پاکستان کی قرار داد کہا، وہ بھی اس لیے کہ چوہدری رحمت کی کوشش سے لفظ پاکستان مشہور ہو چکا تھا لیکن کانگریس کے ہندو نواز پریس نے طنز کے طور پر اس نام کو اس قدر اچھالا کہ یہی نام مسلمانان ہند کا نصب العین اور مقدر بنا۔

اس قرار داد کا منظور ہونا تھا کہ ہندو پریس نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ کئی اخبارات نے اسے ”گھناؤنی سازش“ اور ”ناقابل عمل“ قرار دیا۔ اس کے جواب میں ایک اخبار ”سٹیٹس مین“ نے مثبت



تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

”یہ ایک انقلابی تجویز ہے، لیکن جو لوگ اس کی مخالفت کرنا چاہتے ہیں انہیں مخالفت سے قبل اس کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے کہ مسلم لیگ نے پوری سنجیدگی سے اسے پیش کیا ہے، اس لیے اسے محض خواب و خیال سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوؤں کو خواہ یہ بات اچھی لگے یا بُری، یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمان اپنے جداگانہ کلچر کا زبردست احساس رکھتے ہیں، لیکن یہ ایسا منشور ہے کہ جو مایوسی کی موجودہ حالت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس تجویز میں ایمان دارانہ طور پر موجودہ ہندو مسلم مسئلے کا قابل عمل حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تجویز پیش کرنے والوں کے نزدیک صرف یہی ایک قابل قبول حل ہے۔“ ایک سائنسی رسالے "The Nature" نے اس قرارداد کی حمایت کرتے ہوئے لکھا:

”آٹھ کروڑ مسلم اقلیت کی آواز کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ آواز ان کی حقیقی ثقافتی روایت کے زندہ رکھنے کے مطالبے پر مبنی ہے۔ ہندوستانی ثقافت کے ہر طالب علم پر یہ بخوبی واضح ہے

کہ اسلامی ثقافت جمہوری اقدار کو فروغ دیتی ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان میں ہندوؤں کی برتری سے انہیں کچھ خدشات لاحق ہیں، جس کی بنیاد پر انے ہندوستان کا برہمنی طبقاتی نظام ہے۔ مسلمانوں کا مطالبہ کتنا ہی ناقابل عمل کیوں نہ ہو، لیکن ان کی ثقافتی روایات کے اس بنیادی فرق کو نظر انداز کر کے نہ تو ہندوستان میں اندرونی طور پر امن قائم رکھا جاسکتا ہے اور نہ ہی انگلستان کی ساکھ کو بیرونی طور پر باقی رکھا جاسکتا ہے۔“

قرار داد پاکستان کی منظوری کے سات سال بعد برصغیر کے مسلمانوں کو ایک علیحدہ وطن پاکستان ملا۔ اس قرار داد کی منظوری کی یادگار کے طور پر شاہی مسجد لاہور کے سامنے منٹو پارک (جسے اب اقبال پارک کہا جاتا ہے) میں عین اسی جگہ جہاں قائد اعظم کی صدارت میں یہ تاریخی اجلاس ہوا تھا، ایک مینار تعمیر کیا گیا ہے جس کی بلندی 196 فٹ 6 انچ ہے۔ اس کا ڈیزائن مرآت خان نے بنایا تھا۔ اس پر انتیس تختیاں نصب ہیں جو پاکستان کے نظریے اور مستقبل کی عکاس ہیں۔ ان پر قرار داد پاکستان اور قرار داد دہلی، اردو، انگریزی اور بنگلہ زبان میں تحریر ہیں۔

### ”کھوج لگائیے“ میں حصہ لینے والوں کے نام

محمد عدنان، عبدالحق، منزل آصف خان، بلال ذوالفقار سلیمانی، آفاق شفیق، انوشہ منظور، کراچی۔ زار اوہاب، اسلام آباد۔ مریم صدیقی، مریم سلیمان بٹ، گوجرانوالہ، شمر خان، بھکر۔ صبح الحسن، سیال کوٹ۔ سمیط رضا، لاہور۔ محمد کلیم، بھکر۔ محمد فرحان، واہ کینٹ۔ عائشہ محبوب، لاہور۔ محمد قمر الزمان، مٹھ ٹوانہ۔ محمد کامران سعید، فیصل آباد۔ محمد انیسال متین، لاہور۔ امامہ محسن، جہلم۔ فاطمہ الزہرہ، لاہور۔ عمراقبال، کراچی۔ ماروی، جھنگ صدر۔ ایمن رانی، کمالیہ۔ محمد نعیم امین، لاہور۔ محمد یاسر قادری، محمد حبیب نواز قادری، نور فاطمہ قادری، خدیجہ نشان، صدام حسین قادری، علی حمزہ رجب قادری، محمد ذیشان اکرم، قادری، حسن رضا سردار قادری، محمد فریاد علی قادری، کامونکی۔ راجا نرہت حیات، پنڈ دادن خان۔ راعنہ جدون، ایبٹ آباد۔ عبد الجبار، لاہور۔ ایمان فاطمہ، راول پنڈی۔ شمر طارق بٹ، گوجرانوالہ۔ فائزہ بابر خان، راول پنڈی۔ یاسر، ملیر کراچی۔ محمد فیاض الحسن، تلہ گنگ۔ محمد احمد رضا انصاری، کوٹ ادو۔ وجیہ الدین، کوہاٹ۔ محمد ہاشم اسلم، حراظفر، گوجرانوالہ۔ محمد اسماعیل خان، نمرہ امین، لاہور۔ زینت ذوالفقار، تلونڈی۔ احمد منیب عامر، رحیم یار خان۔ اشرف تواب، راول پنڈی۔ تحریم الاسلام، سرگودھا۔ فضا فواد میر، عیشاء افضل، گوجرانوالہ۔ افراح اکبر، لاہور۔ اسامہ صغیر، پاکپتن۔ اطہر فاروق، روات۔ عائشہ سعید، راہوالی۔ عذرہ سعید، چکی شیخ جی۔ محمد عزیز چٹھہ، گوجرانوالہ۔ زینب ناصر، فیصل آباد۔ فاطمہ سلیم، لاہور۔ شوال فاطمہ، شیخوپورہ۔ فاطمہ الزہرہ، ڈیرہ اسماعیل خان۔ منجی حبیب، لالہ موسیٰ۔ آمنہ شہزادی، گجرات۔ طلحہ اعجاز، باڑہ ہملٹ۔ عبداللہ شاہ، دریا خان۔ شگفتہ اکرم عابد، کمباہاں۔ عذیر اشرف، گجرات۔ ندا جمال، سرگودھا۔ ام حبیبہ بتول، خان پور۔ محمد نوفل بن اخلاق، اسلام آباد۔ نادیہ حسن، کوٹری۔ ☆☆



## کھوج لگایے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔



اعظم اسکوائر کے فلیٹ میں ایک ستر سالہ بوڑھا تہا رہائش پذیر تھا۔ عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھا اور اس نے استعمال کی ضروری اشیاء دکانداروں سے رابطہ کر کے اپنی رہائش گاہ پر ہی منگوا لیتا تھا۔ بدھ کے روز ڈاکیا خط تقسیم کرتے ہوئے اس کے فلیٹ پر آیا تو اسے بوڑھے کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے دروازے کے تالے کے سوراخ میں سے اندر کمرے کی طرف جھانک کر دیکھا تو اسے بوڑھے آدمی کی لاش دکھائی دی۔ ڈاکے نے فوراً دن فائیو (15) پر پولیس کو اطلاع کی اور پولیس تفتیشی افسر کے ساتھ موقع پر پہنچ گئی۔ جائے وقوعہ پر یعنی فلیٹ کے باہر پولیس کو دودھ کی دو بوتلیں، منگل کے روز کا اخبار، کچھ بغیر کھلے خط اور گفٹ بکس پڑے ہوئے ملے۔ پولیس نے قرب و جوار کے لوگوں کو شامل تفتیش کیا لیکن کسی سے کوئی سراغ نہ مل سکا اور نہ ہی کوئی عینی شاہد مل سکا۔ اگلے دن پولیس نے اس معمر کو حل کر کے ایک شخص کو گرفتار کر لیا۔

پیارے بچو! آپ کھوج لگا کر بتائیں کہ پولیس نے کس شخص کو اور کس شک کی بناء پر گرفتار کیا جس نے اس بوڑھے آدمی کو قتل کیا۔



فروری 2014ء میں شائع ہونے والے ”کھوج لگائیے“ کا صحیح جواب یہ ہے: پہلے ایک پاؤ گوشت سادہ پکالیں، پھر اسی کا قیمہ بنا لیں۔ اسی قیمے سے کباب بنا لیں۔ اس طرح ایک پاؤ گوشت سے تین مختلف کھانے بن گئے۔

فروری 2014ء کے کھوج لگائیے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

- 1- امتثال سلیم، حیدر آباد
- 2- ثوبیہ اسلم، میرپور آزاد کشمیر
- 3- سعیدۃ الاسلام، بورے والا
- 4- لاریب ملک، لاہور
- 5- ایم جبران، لاہور





## محرم محرم

خوش رہتی ہوں گلابوں میں  
مر جاتی ہوں بند کتابوں میں  
اللہ نے مجھے بخشی ہے آزادی  
کیوں کرتے ہو میری بربادی

(کشف جاوید، فیصل آباد)

### ایک بار

کسی نے کہا کہ بچپن اک بار ملتا ہے، خوب کھیل کود کر لو۔ کہیں  
سے آواز آئی۔ جوانی دیوانی ہے، سارے مزے کر لو۔ کہیں سے آواز  
آئی۔ کالج اور یونیورسٹی لائف ایک بار ملتی ہے، خوب مستی کر لو۔  
لیکن افسوس کوئی یہ نہیں کہتا کہ زندگی ایک بار ملتی ہے۔

### مساوات

زندگی بے بس خاموش پرندے کی طرح وقت کو اڑاتی، دے  
پاؤں کٹے جا رہی ہے۔ جیسے کوئی ہوا اپنے ساتھ خس و خاشاک  
سب اڑالے جائے۔ غم پھانس بن کر کبھی سانس روکتے ہیں مگر خوشی  
کا نوالہ نگلتے ہی سانس پھر بحال ہو جاتے ہیں۔

یہاں کچھ ایسے ہیں، جو ایک مسکراہٹ اور خوشی کے ایک پل کو  
ترستے ہیں اور کچھ ایسے ہیں، جو خوشیوں سے دامن بھرے چاندی  
ٹھنڈک میں زندگی گزارتے ہیں اور کچھ تو کفن بھی ادھار کا پہنا  
کرتے ہیں۔

پر یہاں مساوات ہے کیوں کہ قبر امیر اور غریب کی ایک ہی  
مٹی سے تیار ہوتی ہے۔  
(جویریہ ظفر، گجرات)

### بکری

ایک دفعہ کونے کے لوگ لوٹ مار کی بکریاں لائے اور انہیں  
بازار میں فروخت کر دیا، اس طرح وہ بکریاں دوسری بکریوں میں  
رل مل گئی۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کو یہ معلوم ہوا تو آپ نے لوگوں  
سے پوچھا، بکریاں کتنے سال تک زندہ رہ سکتی ہیں۔ ایک شخص نے

## مینارِ پاکستان

عظمتوں کا نشان کھڑا ہے  
مینارِ پاکستان کھڑا ہے

بڑی تاریخ چھپائے بچو  
آزادی کو سجائے بچو  
اکیلا ہی سنسان کھڑا ہے

عظمتوں کا نشان کھڑا ہے  
مینارِ پاکستان کھڑا ہے

دیکھ کے اسے سلام کریں ہم  
خود سے ہم کلام کریں ہم  
اپنے وطن کی شان کھڑا ہے

عظمتوں کا نشان کھڑا ہے  
مینارِ پاکستان کھڑا ہے

اتحاد کی علامت ہے یہ  
ہم سب کی امانت ہے یہ  
لیے سب کی پہچان کھڑا ہے

عظمتوں کا نشان کھڑا ہے  
مینارِ پاکستان کھڑا ہے

(اجمل شاہین، لاہور)

### تنتلی

تنتلی ہوں میں بھولی بھالی  
پھرتی ہوں میں ڈالی ڈالی  
رنگوں کی شہزادی ہوں میں

اڑنے کی عادی ہوں میں  
پھولوں کا رس پیتی ہوں  
رس پی کر جیتی ہوں



جواب دیا۔ سات سال، تو آپ نے کونے میں رہتے ہوئے سات سال تک بکریوں کا گوشت نہیں کھایا۔  
(محمد عثمان علی، جھنگ)

### بہتر ہے زہر پی لو

حاج بن یوسف نے اپنے دور کے مشہور طبیب شیب بن زید سے فرمائش کی کہ مجھے طب کی کچھ اچھی باتیں بتاؤ۔ طبیب نے کہا:

- ☆ گوشت صرف جوان جانور کا کھاؤ۔
- ☆ جب دوپہر کا کھانا کھا لو تو تھوڑی دیر سو جاؤ اور شام کا کھانا کھا کر چلو، چاہے تمہیں کانٹوں پر چلنا پڑے۔
- ☆ جب تک پیٹ کی پہلی غذا ہضم نہ کر لو، دوسرا کھانا نہ کھاؤ، چاہے تمہیں 3 دن لگ جائیں۔

- ☆ جب تک بیت الخلاء نہ جاؤ، سونے کے لیے بستر پر نہ جاؤ۔
- ☆ پھلوں کے نئے موسم میں پھل کھاؤ، موسم جانے لگے تو پھل کھانا چھوڑ دو۔

☆ کھانا کھا کر پانی پینے سے بہتر ہے زہر پی لو، ورنہ کھانا ہی نہ کھاؤ۔  
(محمد احمد خان غوری، بہاول پور)

### اشفاق احمد اپنی کتاب زاویہ میں لکھتے ہیں

- ☆ اگر آپ کو کوئی اچھا لگے تو اچھا وہ نہیں، اچھے آپ ہو کیوں کہ آپ اس میں اچھائی تلاش کرتے ہو۔
- ☆ اگر کوئی آپ کو برا لگتا ہے تو پرواہ نہیں، بُرے آپ ہو کیوں کہ آپ اس میں بُرائی تلاش کرتے ہو۔

- ☆ خوب صورت ہونا اہم نہیں، اہم ہونا خوب صورتی ہے۔
- ☆ رشتے خون کے نہیں احساس کے ہوتے ہیں، اگر احساس ہو تو اجنبی بھی اپنے لگتے ہیں اور اگر احساس نہ ہو تو اپنے بھی اجنبی۔  
(ایمان علی، راول پنڈی)

### فاقہ، تنگ دہشتی اور بیماری کے اسباب

- ☆ مہمان کو حقارت سے دیکھنا۔
- ☆ قرآن پاک کو بے وضو ہاتھ لگانا۔
- ☆ بغیر بسم اللہ پڑھے کھانا کھانا۔
- ☆ جوتے پہنے ہوئے کھانا کھانا۔

☆ نماز قضاء کرنا۔

☆ دروازے پر بیٹھنا۔

☆ اولاد کو گالی دینا۔

☆ صبح کے وقت سونا۔

☆ کھڑے ہو کر نہانا۔

☆ گانے باجے میں دل لگانا۔

☆ بزرگوں کے آگے چلنا۔

☆ قبرستان میں ہنسنا۔

☆ مغرب کے بعد سونا یا مغرب اور عشاء کے درمیان سونا۔

☆ کھانا اندھیرے میں کھانا۔

☆ سجدہ تلاوت نہ کرنا۔

(محمد حمزہ لغاری، میاں والی)

### زندگی کے رہنما اصول

- ☆ جھوٹ بول کر جیت جانے سے بہتر ہے سچ بول کر ہار جاؤ۔
- ☆ سختی کا ہاتھ اسے کبھی نہ کبھی دولت مند ضرور بنا دیتا ہے۔
- ☆ عقل مند سوچ کر بولتا ہے اور بے وقوف بول کر سوچتا ہے۔
- ☆ اللہ کی تقسیم پر راضی ہونا سچا ایمان ہے۔
- ☆ دولت کی دیوی دیانت داری کے مندر میں رہتی ہے۔
- ☆ جو شخص میانہ روی اختیار کرتا ہے وہ کبھی مفلس نہیں ہوگا۔

(حفصہ اعجاز، صوابی)

### سنہرے موتی

- ☆ دنیا میں کامیابی کا انحصار عزم پر ہے نہ کہ عقل پر۔
- ☆ فن (آرٹ): فن ایک مقدس جھوٹ ہے۔
- ☆ تاریخ کا گراموفون: تاریخ ایک طرح کا ضخیم گراموفون ہے۔ جس میں قوموں کی صدائیں محفوظ ہیں۔
- ☆ کام یاب انسان: اپنی جدوجہد کو پہچانیے اور اپنی صلاحیتوں کو پرکھیے، پھر زندگی میں آپ کی کامیابی یقینی ہے۔
- ☆ حکمت اور دانائی مفلس کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔

(حسن رضا، فیصل آباد)

.....☆.....



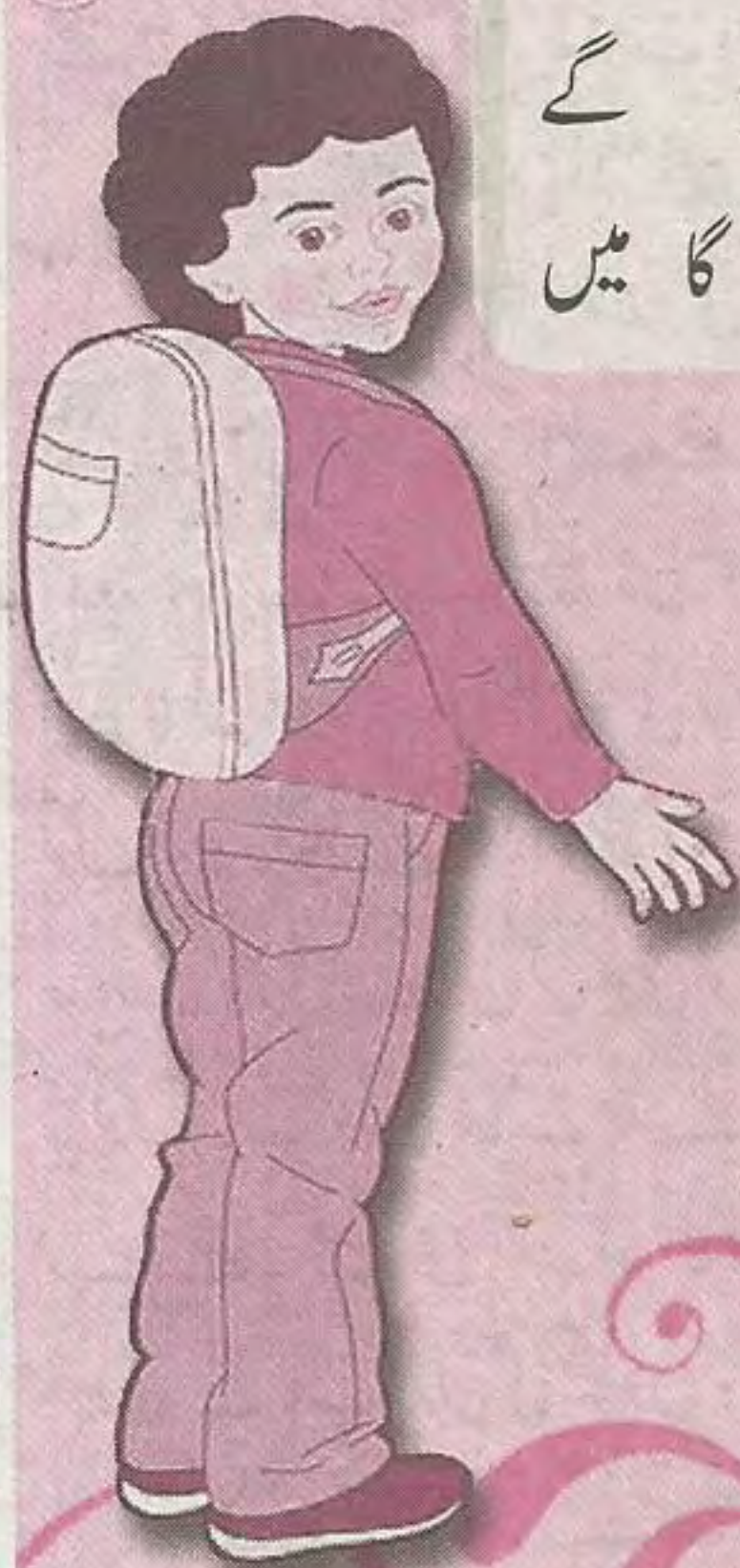


# عبداللہ کی ضد



امی مجھ کو بستہ لے دو  
 کندھے پر لٹکاؤں گا میں  
 جیبوں والا بستہ لوں گا!  
 پانی لے کر جاؤں گا میں  
 کاپی اور کتابیں لے دو  
 پہنوں گا اتراؤں گا میں  
 لکھنا پڑھنا سیکھوں گا میں  
 علم کے موتی پاؤں گا میں  
 ہمت سے ہر کام کروں گا  
 سب سے اوّل آؤں گا میں  
 سارے مجھ کو اچھا کہیں گے  
 تھوڑا سا شرماءوں گا میں

مہنگا نہیں تو سستا لے دو  
 کل سے مدرسے جاؤں گا میں  
 تھرس بھی اک اچھا لوں گا  
 کل سے مدرسے جاؤں گا میں  
 یونی فارم جرائیں لے دو  
 کل سے مدرسے جاؤں گا میں  
 آگے بڑھنا سیکھوں گا میں  
 کل سے مدرسے جاؤں گا میں  
 محنت صبح و شام کروں گا  
 کل سے مدرسے جاؤں گا میں  
 پیارا پیارا بچہ کہیں گے  
 کل سے مدرسے جاؤں گا میں



رفیع یوسفی محرم





دان میں پھینکتے ہوئے بولے۔

”کچھ نہیں ابو، ہم نے تو یہ تھیلیاں پھینکی تھیں، لیکن آپ نے ان کو کوڑے دان میں ڈال دیا۔“ چھ سالہ فاطمہ ڈرم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”ارے بیٹا، پھر ان کوڑے دانوں کا کیا فائدہ؟“

”لیکن ابو، کون ان تک آنے کی زحمت کرتا ہے۔“ فاطمہ

لاپرواہی سے بولی۔

”بیٹا، اگر کوئی غلط کام کرے تو آپ بھی غلط کام کریں گے؟“

امی جان نے پہلی مرتبہ لب کشائی کی۔

”ہاں بیٹا، تمہاری امی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ کچرا پھینکنے

سے آلودگی بڑھتی، فضا خراب ہو جاتی ہے اور سمندر کی خوب صورتی

میں کمی آتی ہے۔ اب دیکھو سمندر اس کچرے کی وجہ سے کتنا بے

رونق لگ رہا ہے۔ کچرا اٹھانے والے بھی کچرا اٹھا کر تھک گئے

ہیں یا وہ ہماری غفلت کی وجہ سے اپنی ڈیوٹی صحیح سے سرانجام نہیں

دے پاتے۔ اس لیے ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم سمندر کو خراب

کرنے کی بجائے اسے صاف ستھرا رکھیں۔“ فاخر صاحب روانی

سے بولنے چلے گئے۔

”دیکھو بیٹا!“ وہ کچھ دیر بعد گویا ہوئے۔ ”اس ملک کو ہمارے

بڑوں نے بڑی مشکل سے قربانیاں دے کر آزاد کرایا تھا۔ نہ جانے

کتنے معصوم گلے کٹے، اس ملک کو حاصل کرنے کے لیے کتنے ہی

لوگوں نے اپنا خون دیا اور شہید ہو گئے لیکن ہم لوگوں کو ایک آزاد

ملک دے گئے جس میں ہم چین و سکون سے سانس لے رہے

ہیں۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ اپنے ملک کو سرسبز و شاداب رکھیں۔

بیٹا، پہلے کے لوگوں کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا اور وہ اس ملک

کی قدر کیا کرتے تھے۔ اپنے ملک کی خاطر اپنی جان دینے کے

لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ شہادت کا رتبہ پانے کا شوق تھا۔ اس

ملک کو نہ جانے کس بد بخت کی نظر لگ گئی ہے کہ وہ اب پہلے جیسا

نہیں رہا۔ اب کے نوجوانوں میں وہ جوش، وہ جذبہ نظر نہیں آتا

جو پہلے کے نوجوانوں میں موجود تھا۔ ہر کسی کو اپنی پڑی ہوئی ہے

کسی کو اس دھرتی کی پرواہ نہیں ہے۔ ہر کوئی اسے خراب کرنے پر

تلا ہوا ہے۔ لوگوں نے مختلف طریقوں سے اس کی خوب صورتی کو

بگاڑ دیا ہے۔ جس کا جہاں جی چاہا، وہیں کچرا پھینک دیا۔ یہ



یہ دھرتی

(محمد عمار صدیقی، کراچی)

”ابو! آپ نے آج ساحل کی سیر کروانے کا وعدہ کیا تھا۔“

منہی آمنہ، ابو سے ساحل جانے کی ضد کرنے لگی۔ ”میری بیٹی کو

سمندر کی سیر کرنی ہے۔“ فاخر صاحب پیار سے اپنی بیٹی کو دیکھتے

ہوئے بولے۔

”جی ابو!“ فاطمہ نے ابو کی بات کا جواب دیا۔ اس کے ساتھ

ہی سارے بچے سمندر جانے کی ضد کرنے لگے اور فاخر صاحب

گھبرا گئے۔

”اچھا ابھی تم سب تیار ہو جاؤ، پھر ہم سمندر کی سیر کرنے

چلتے ہیں۔“ یہ کہہ کر فاخر صاحب واش روم کی طرف بڑھ گئے۔

”ہمارے ابو، زندہ باد!“ بچوں نے پُر جوش نعرہ لگایا۔

کچھ دیر بعد یہ قافلہ سمندر کی طرف رواں دواں تھا۔ قافلہ کیا

تھا۔ ابو، امی، آمنہ اور فاطمہ تھے۔ یہ سب موسم سے بھرپور لطف

اندوز ہو رہے تھے۔ راستے میں کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی

البتہ فاطمہ اور آمنہ کی ہلکی پھلکی نوک جھونک جاری تھی۔ آخر کار یہ

لوگ سمندر پہنچ گئے۔ ”آؤ بچو آؤ، دیکھو سمندر کیسا ہوتا ہے۔“ فاخر

صاحب گاڑی سے نکل کر بچوں کو آوازیں دینے لگے۔ کچھ دیر بعد

یہ لوگ پاپ کورن کھاتے ہوئے سمندر کی نرم نرم ریت پر چل

رہے تھے۔ جیسے ہی آمنہ اور فاطمہ کے پاپ کورن ختم ہوئے،

انہوں نے پاپ کورن کی تھیلیوں کو ساحل پر پھینک دیا۔

”ارے یہ کیا کر رہے ہو؟“ فاخر صاحب تھیلیوں کو کوڑے



ڈنڈے پڑے۔ استاد کے جانے کے بعد دو لڑکوں کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ عمر نے انہیں چھڑانے کی کوشش کی تو اسے ایک لڑکے نے مکا رسید کر دیا۔ عمر کا سر گھوم گیا اور وہ چپ چاپ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

سکول سے واپسی پر ایک گھر کے سامنے کچھڑ سے عمر پھسل گیا جس سے اس کے کپڑے گندے ہو گئے۔ گھر پہنچ کر اس نے کپڑے تبدیل کیے اور بستر پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ آج وہ سارا دن پریشان رہا۔ اسے آج اتنی تکلیف کیوں پہنچی۔ جب اسے کچھ نہ سوچا تو اس نے دن کا پورا واقعہ اپنی امی کو سنایا۔ اس کی امی نے اسے دلاسا دیا اور یہ واقعہ اس کے ابو کو بتانے کا فیصلہ کیا۔

اگلے دن سکول سے چھٹی تھی۔ دن کو بارہ بجے عمر کے گھر کچھ مہمان آئے۔ عمر کے ابو نے انہیں ایک الگ کمرے میں بٹھایا اور کچھ دیر ان سے باتیں کرتے رہے۔ پھر انہوں نے عمر کو بھی بلا لیا۔ مہمان جن کا نام مولوی قاسم تھا۔ بڑی اچھی طبیعت کے مالک تھے۔

انہوں نے پیار سے عمر کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔  
”بیٹا! تم نماز پڑھتے ہو۔“

”جب وقت ملتا ہے تو پڑھ لیتا ہوں۔“ عمر شرمندہ ہو گیا۔  
”بیٹا! نماز پڑھنے سے زندگی میں سکون پیدا ہوتا ہے۔ جو نماز پڑھتا ہے اس سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے۔“ مولوی قاسم نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا! ہم یہاں آزاد نہیں ہیں۔ ہماری شریعت ہمیں جو احکام بتاتی ہے ہمیں ان پر عمل کرنا چاہیے۔ اس سے اللہ راضی ہو گا اور روزِ حشر تمہیں بخش دے گا۔ قیامت کے دن سب سے پہلے یہ سوال کیا جائے گا کہ کیا تم نماز پڑھتے تھے۔ جو آدمی اس سوال کا جواب صحیح دے گا، اس کے لیے آگے آنے والی منزلیں آسان ہو جائیں گی اور جو نماز نہ پڑھتا ہو گا، اس کے لیے آگے آنے والی منزلیں مشکل ہو جائیں گی۔ تو بیٹا! تمہارا کیا خیال ہے، تم کیا جواب دو گے؟“

عمر خاموش رہا، وہ دل ہی دل میں نادام ہو رہا تھا۔ آخر اس کے ہونٹ ہلے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”مولوی صاحب! آئندہ میں نماز

کوڑے دان کس لیے موجود ہیں، لیکن کوئی ان کا استعمال نہیں کرتا۔ اس لیے بیٹا وعدہ کرو کہ اس ملک کو خوب صورت رکھنے کے لیے اسے صاف ستھرا رکھو گے۔“

”جی ابو، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم اس ملک کو صاف ستھرا رکھیں گے کیوں کہ یہ دھرتی ہمیں اپنی جان سے زیادہ پیاری ہے۔“ فاطمہ اور آمنہ پرجوش لہجے میں بولیں۔ ”شاباش میری بیٹیوں۔“ ابو کی پیار بھری آواز گونجی۔

(پہلا انعام: 120 روپے کی کتب)

عزم

(محمد عمران، گوجرانوالہ کینٹ)

”عمر بیٹا! اذان ہو رہی ہے۔ مسجد میں نماز پڑھ آؤ۔“ یہ عمر کی امی کی آواز تھی جو اسے نماز کے لیے کہہ رہی تھی مگر عمر ہمیشہ کی طرح انکار کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

عمر کا تعلق ایک دین دار گھرانے سے تھا۔ وہ آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ویسے تو وہ اچھا تھا لیکن اس میں ایک خامی تھی۔ وہ یہ تھی کہ عمر باقاعدگی سے نماز ادا نہیں کرتا تھا۔ آج تو اس کو اس کے ابو سے مار بھی پڑی جس کی وجہ سے اس نے نمازِ مغرب ادا کی اور عشاء کی نماز پڑھنے سے پہلے ہی سو گیا۔

صبح اس کے ابو نے اسے جگایا کہ نمازِ فجر ادا کرے اور ساتھ ہی اسے نصیحت بھی کی۔ ”بیٹا! جو آدمی فجر کی نماز ادا کر کے دن کا آغاز کرتا ہے، اس کا دن اچھا گزرتا ہے۔“ لیکن اس نے جب نماز نہ پڑھی تو اس کے والد پریشان ہو گئے۔ آخر انہیں ایک ترکیب سوچھی۔  
عمر صبح سات بجے جاگا۔ جلدی سے تیار ہو کر ناشتہ کیا اور سکول روانہ ہو گیا۔ آج اس کا ریاضی کا ٹیسٹ تھا۔ ریاضی کے استاد بڑے سخت مزاج تھے مگر عمر کو کوئی پریشانی نہ تھی کیوں کہ اسے تمام سوال یاد تھے۔ جب وہ ٹیسٹ دینے بیٹھا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنا قلم گھر چھوڑ آیا ہے۔ اس نے دوستوں سے قلم مانگا مگر کسی کے پاس قلم نہیں تھا۔ جب تک عمر دوسری کلاس سے قلم لے کر آیا تب تک وقت کم رہ گیا تھا۔ عمر نے جلدی جلدی سوال نامہ حل کرنا شروع کر دیا مگر پانچ میں سے ابھی تک دو سوال ہی حل کر پایا تھا کہ وقت ختم ہو گیا۔ تین سوال نہ کرنے کی وجہ سے اسے تین



پڑھوں گا۔“ مولوی قاسم خوشی سے بولے۔ ”کیا تم وعدہ کرتے ہو؟“  
 ”جی! میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی بھی نماز نہیں چھوڑوں  
 گا۔“ عمر ایک نئے عزم سے بولا۔ عمر کے ابو نے اسے نماز کی فضیلت  
 اور اس کے ثمرات سے بھی آگاہ کیا اور کہا کہ نماز جنت کی کنجی ہے۔  
 اتنے میں ظہر کی اذان کی آواز آئی تو عمر ایک نئے عزم کے  
 ساتھ مسجد کی طرف چل دیا۔ (دوسرا انعام: 100 روپے کی کتب)

### وقت ایک سانس نہیں رہتا

(مختیہ مریم، لاہور)

جیسے ہی بریک کی گھنٹی بجی، ماریہ عائشہ کے پاس آئی اور کہا۔  
 ”عائشہ یہ دیکھو! میرا نیا آئی پیڈ! بابا نے کل مجھے میری سال  
 گرہ پر تحفہ دیا تھا۔“ ماریہ فخر سے آئی پیڈ اپنی دوست عائشہ کو دکھایا  
 جو کہ حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

ماریہ اور عائشہ گہری سہیلیاں تھیں۔ ماریہ اپنے ماں باپ کی  
 اکلوتی بیٹی تھی جو اس کی ہر جائز اور ناجائز خواہش کو پورا کرنا اپنا فرض  
 سمجھتے تھے لیکن ماریہ صرف چیزیں لینے پر ہی اکتفا نہ کرتی بلکہ اسے  
 اپنی قیمتی اشیاء دوسروں کو اتر اتر کر دکھائے بغیر چین ہی نہ آتا تھا۔  
 عائشہ کی چار بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ وہ جب بھی ماریہ کی کوئی نئی  
 چیز دیکھتی، کئی روز تک وہ اس کے لیے کڑھتی رہتی۔ یوں تو عائشہ  
 کے ماں باپ بھی اتنے غریب نہ تھے لیکن چھ بچوں کی کفالت کے  
 ساتھ وہ ان کی ہر منہ بولی خواہش پوری نہ کر سکتے تھے۔

اس روز بھی جب ماریہ نے عائشہ کو آئی پیڈ دکھایا تو وہ دل  
 مسوس کر رہ گئی۔ اسے کون اتنا مہنگا آئی پیڈ خرید کر دے سکتا تھا۔  
 اس نے اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ماریہ جلدی سے بولی۔  
 ”ارے! دیکھنا، یہ بہت قیمتی ہے۔ خراشیں نہ پڑ جائیں۔“

عائشہ نے ہاتھ پیچھے کر لیے۔ اُسے بہت بُرا لگا تھا۔ وقت  
 گزرتا گیا اور عائشہ نے سکول کی تعلیم مکمل کر لی۔ اس کے ماں  
 باپ کا خواب اسے ڈاکٹر بنانا تھا، اس نے میڈیکل میں داخلہ لے  
 لیا۔ میڈیکل کے شعبے میں آکر وہ بہت مصروف ہو گئی تھی۔ اس نے  
 کئی بار ماریہ سے رابطہ کرنے کا سوچا لیکن اسے اس کی اتراہٹ بھی  
 یاد آ جاتی جو وہ اپنی نئی چیز دکھانے پر اختیار کر لیا کرتی تھی۔ سکول  
 میں اس کی اور کوئی خاص دوست نہ تھی۔ وقت پُر لگا کر اڑتا گیا اور

آخر وہ دن بھی آ گیا جب اس نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر  
 لی۔ اس کے باقی بہن بھائی بھی پڑھ لکھ کر اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو  
 چکے تھے۔ اب ان کے ہاں دولت کی ریل پیل تھی اور اب وہ اکثر  
 سوچا کرتی کہ یہ دنیاوی چیزیں تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ جس کو اللہ  
 چاہے اسے عطا کرتا ہے۔

”کیا آپ ہی ڈاکٹر عائشہ ہیں؟“ پہلے تو عائشہ نے اسے نہ  
 پہچانا لیکن قریب آنے پر اسے وہ شکل جانی پہچانی لگی۔ ”ارے.....  
 یہ تو تم ہو ماریہ!“ وہ جلدی سے اٹھی اور اسے جا کر گلے لگایا۔  
 ”ماریہ! تم کتنی بدل گئی ہو! اچھا تم ذرا ادھر بیٹھو، بس دو تین مریض  
 ہی رہ گئے ہیں۔“ عائشہ نے اسے اپنے پاس پڑی کرسی پر بٹھایا اور جیسے  
 تیسے مریض چیک کر کے انہیں فارغ کیا۔ کچھ ہی دیر بعد ملازم لوازمات  
 کی ٹرے لیے اندر داخل ہوا جو عائشہ نے اسے کہلوا بھیجے تھے۔  
 ”اچھا تو اب بتاؤ کیسے آنا ہو؟“ عائشہ نے پاس بیٹھتے ہوئے  
 ماریہ سے پوچھا۔

”عائشہ مجھے معاف کر دو!“ ماریہ نے بس اتنا ہی کہا اور رونے  
 لگی۔ ”لیکن ہوا کیا ہے؟“ عائشہ نے تجسس سے پوچھا کیوں کہ اس  
 کے ذہن میں کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا جس کے لیے ماریہ اس سے  
 معافی مانگتی۔ ”میں اب جان گئی ہوں کہ تمہارا دل کتنا دکھتا ہو گا جب  
 میں تمہیں نیچا دکھانے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ میرا غرور تھا اور مجھے  
 اپنے کیے کی سزا مل رہی ہے۔“ پھر ماریہ نے اسے اپنی زندگی کی  
 کہانی سنائی کہ کس طرح اس کے سکول سے فارغ ہونے کے کچھ  
 دن بعد اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے باپ نے دوسری  
 شادی کر لی۔ اس کی سوتیلی ماں اور اس کی بیٹی نے ماریہ کی ساری  
 دولت ہتھیا لی۔ باپ یہ سب برداشت نہ کر سکا اور دنیا سے کوچ کر  
 گیا۔ ماریہ کو سب سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ وہ اپنی تعلیم بھی  
 پوری نہ کر سکی۔ عائشہ نے سب سننے کے بعد اسے اپنے گھر جانے پر  
 تیار کر لیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ماریہ اس کے ساتھ ہی رہے  
 گی۔ آج اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ واقعی جسے اللہ چاہتا ہے  
 بادشاہت عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے بادشاہ سے فقیر بنا دیتا ہے۔

(تیسرا انعام: 80 روپے کی کتب)



ہیں، میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ ششم جماعت میں پڑھتی ہوں۔ تعلیم و تربیت کی بہت بڑی فین ہوں۔ جنوری کا شمار بہت دل چسپ تھا۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میری دوست عائشہ، علیزہ، رباب اور ہادیہ بھی اس رسالے کو بہت پسند کرتی ہیں۔ فروری میں میرے والد صاحب، آپنی سمین، ٹیچر شازیہ اور میرے بھائی حسان کی سال گرہ ہے۔

☆ پیاری شجیہ! آپ سب کو سال گرہ مبارک ہو۔

میرا نام شانزے شاہین ہے۔ بہاول پور میں رہتی ہوں۔ دوم جماعت میں پڑھتی ہوں۔ تعلیم و تربیت ایک بہترین رسالہ ہے۔ مارچ میں میری سال گرہ ہے۔ امتحان بھی ہیں۔ میری آپنی شجیہ ہر امتحان میں نمایاں پوزیشن لیتی ہیں۔ ہماری دو فرمائشیں ہیں۔ ایک علامہ اقبال کی نظم ”یارب دل مسلم کو.....“ اور دوسری ”ذائقہ کارنر“ میں گول گپوں کی ترکیبیں شائع کریں اور ہماری تحریریں بھی۔

☆ آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ سال گرہ اور امتحان کے لیے دعائیں۔

فروری کا شمار ہر لحاظ سے اچھا تھا۔ میں نے مقابلہ اردو نویسی میں ضلع چکوال میں پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔ اس کام یابی میں تعلیم و تربیت کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ میرے لیے دعا کریں کہ میں راول پنڈی ڈویژن میں پہلی پوزیشن حاصل کروں۔

(محمد فیاض الحسن، تلہ گنگ)

☆ ڈیر فیاض! آپ کی کام یابی کے لیے ڈھیروں دعائیں۔ فروری کا شمار ملا تو دل خوشی کے مارے باغ باغ ہو گیا۔ کشمیر کی کہانی نے گویا دل چھو لیا۔ صدیق سالک کی تحریر اچھی لگی جسے پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ہماری پاک فوج مشکل وقت میں کس حد تک جانے کو تیار ہے۔

(نہیب ناصر)

☆ ڈیر نہیب! آپ ایک لائن چھوڑ کر صاف لکھائی میں کہانی لکھیں۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ اس دور میں تعلیم و تربیت ایک اچھا کردار ادا کر رہا ہے۔ رسالے کی سالانہ قیمت کیا ہے؟

(خالد علی شاہ، صوابی)

☆ ڈیر خالد! رسالے کی سالانہ قیمت 500 روپے ہے۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ فروری میں میری سال گرہ تھی۔ فروری کا شمار بہت پسند آیا۔ کشمیر کی کہانی معلومات افزاء تھی۔ میں تین سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ میں آپ



## مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

اس ماہ کا تعلیم و تربیت بھی ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ سب کہانیاں ٹاپ پر تھیں۔ کشمیر کی کہانی سب سے اچھی تھی۔ اشعار اس بار بھی نہیں تھے۔ نظمیں اچھی تھیں۔ پہلے کئی خط لکھے مگر شائع نہیں ہوئے۔

(ثمرہ طارق بٹ، گوجرانوالہ)

☆ اب تو آپ کا خط شائع ہو گیا ہے۔ خوش ہو جائیں۔ میرا نام محمد کلیم ہے۔ میں بھکر میں رہتا ہوں۔ میں دو سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ میرے امتحان قریب ہیں دعا کریں کہ میں اول آؤں۔ فروری کے شمارے میں عجیب امتحان، بابا جی اور نظم علم اور نماز اچھی لگیں۔

اس بار بھی معلومات عامہ بھیج رہا ہوں۔ میں نے پہلے بھی بھیجی ہیں لیکن آپ نے شائع نہیں کی۔ اس بار ضرور شائع کیجئے۔ نہیں تو میں ناراض ہو جاؤں گا۔

(محمد ریان احمد، اسلام آباد)

☆ ڈیر ریان! آپ ناراض مت ہوں۔ اس سلسلے میں آپ ٹیلی فون پر مجھ سے رابطہ کیجئے۔

پیاری بابی! میں آپ کا رسالہ گیارہ سال سے پڑھ رہی ہوں۔ جب میں بہت چھوٹی تھی اور یہ 1998ء سے ہمارے گھر آ رہا ہے۔ پہلی بار خط لکھ رہی ہوں، ضرور شائع کیجئے گا۔ آپ کا رسالہ بہت زبردست ہے۔

(فاطمہ ارشد، سمبڑیاں)

☆ ڈیر فاطمہ! آپ کا خط پڑھ کر خوش ہوئی۔ آپ رسالے میں بھرپور طریقے سے حصہ لیں۔

شجیہ شاہین نے بہت خوب صورت رنگوں سے سجا خط لکھا ہے۔ لکھتی



سے ناراض ہوں کہ میں نے پانچ مرتبہ خط لکھا اور ایک بھی شائع نہیں ہوا۔ (زارا وہاب، اسلام آباد)

☆ لیجئے پیاری زارا! آپ کے خط کا جواب حاضر ہے۔

میں چار سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ مجھے بے حد پسند ہے اور ہر ماہ شدت سے انتظار کرتی ہوں۔ عجیب امتحان اور انتقام کی ہار بہت اچھی تھیں۔ نیم حکیم پڑھ کر ہنسی آئی۔ آپ نے نئے سلسلے شروع کر کے بہت اچھا کیا۔ میں نے تعلیم و تربیت کی website پر رجسٹریشن کی لیکن error آ گیا۔ ہونہار مصور میں ہیڈ مسٹر لیس سے کیسے تصدیق کروائی جائے۔ (ماہم اعجاز، گوجرانوالہ)

☆ ڈیر ماہم! ویب سائٹ کے لیے آپ ٹیلی فون پر رابطہ کریں۔ ہونہار مصور میں ہیڈ مسٹر لیس صاحبہ تصدیق کریں کہ یہ تصویر ماہم اعجاز نے بنائی ہے اور اپنے دستخط کر دیں۔

میرا نام فاطمہ سلیم ہے۔ پیاری آپنی عابدہ کو نیا سال مبارک ہو۔ میں چھٹی جماعت میں پڑھتی ہوں۔ میں گیارہ سال کی ہوں۔ میں تعلیم و تربیت کی نئی شاگرد ہوں۔ میں نے جیسے ہی اس کے بارے میں سنا تو فوراً پایا سے منگوا لیا اور بہت پسند آیا۔ جیسے ہی کوپن دیکھا تو سوچا بھیجوں یا نہ۔ میرا خط ضرور شامل کریں۔ ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا اور میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی اور کبھی کچھ نہیں بھیجوں گی۔

☆ پیاری فاطمہ ناراض مت ہوں۔ آپ کا خط شامل اشاعت ہے۔ پیار بھری دھمکیاں نہ دیا کریں۔ ہم اپنے پیارے پیارے ساتھیوں کو کبھی بھی ناراض نہیں کریں گے۔ آپ آئندہ شمارے میں حصہ لیں ورنہ ہم اداس ہو جائیں گے۔

☆ رشیدہ عدنان، ماہ نور عثمانی، کراچی۔ محمد عبداللہ نیازی، بھکر۔ حرا ظفر نے گوجرانوالہ اور عروج رحمن، واہ کینٹ سے پہلی بار خط لکھا ہے۔ ان سب کا بے حد شکریہ اور ان کے لیے امتحان میں کامیابی کے لیے بہت سی دعائیں۔

میں ہر بار خط لکھتی ہوں لیکن آپ شائع نہیں کرتے۔ اسلامک کارنر بھیجا وہ بھی شائع نہیں کیا۔ کیوں؟ (عشاء سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

☆ پیاری عشاء! اس سلسلے میں آپ مجھ سے ٹیلی فون پر رابطہ کریں۔ تعلیم و تربیت کی آمد..... پورے ماہ کے بعد ہم تو انتظار کر کے بس..... تعلیم و تربیت میں لکھا اور پھر انتظار کرنا میں عجیب سی لذت

ہوتی ہے مگر ہر دفعہ تھوڑی ایسا ہوتا ہے ایک دفعہ ردی کی ٹوکری سے ملاقات ہوئی تو بولی کہ ”سوال یہ ہے کہ“ کے لیے 10 تاریخ تک آئی تو ٹھیک ورنہ میری خوراک۔ اپنا خیال رکھیں اور ردی کی ٹوکری کی خوراک کا بھی۔ شمارہ سپرہٹ تھا۔ میری طرف سے تمام ٹیم کو سلام۔ (گوہر زمان، گوجرانوالہ)

☆ اس دفعہ ردی کی ٹوکری نے آپ کے خط کو اپنی خوراک نہیں بنایا کیوں کہ ردی کی ٹوکری کی خوراک غیر معیاری تحریریں ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو سلامت رکھے اور اسی طرح تعلیم و تربیت کی خدمت کرنے کی توفیق دے۔ (آمین) میں اس رسالے کا بچپن سے قاری ہوں۔ اس میں میرا بچپن سمایا ہوا ہے جو اس کے بغیر نامکمل ہے۔ اس کے بغیر سکون نہیں ملتا۔ اس دفعہ کچھ چیزیں ارسال کی ہیں، نظر کرم کریں۔

آپ سے گزارش ہے کہ میگزین میں ”جنگل سے لے کر منگل“ تک کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔ اور پاکستان کے جتنے بھی تاریخی مقامات ہیں، ان کی بھی سیر کرائی جائے۔ صوفی نیاز مند کے بغیر تعلیم و تربیت نامکمل ہے، یہ دوبارہ شروع ہو جائے تو اچھا ہوگا۔ آپ نے قندمکر کا سلسلہ شروع کیا، وہ ختم کر دیا ہے۔

اس دفعہ تمام کہانیاں، لطیفے، سب ہی اچھے تھے کیوں کہ جس سے محبت ہو وہ اچھا ہی لگتا ہے۔ (اسوہ فاطمہ، محمد جعفر، گروٹ)

میں امید کرتا ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ اس ماہ کا رسالہ بہت دیر سے ملا۔ رسالہ جلدی بھیجا کریں۔ اس کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ فروری کا شمارہ سپرہٹ تھا۔ سرورق دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ آپ پرانے قارئین کے خط شائع نہیں کرتے۔ جلدی سے کوئی نیا ناول شروع کریں۔ عجیب امتحان، سکھ کی گنتی، بہت اچھی لگیں۔ مجھے ابھی تک میرا انعام نہیں ملا۔

(محمد احمد رضا انصاری، کوٹ ادو)

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ فروری کا شمارہ کشمیر کے حوالے سے بہت خاص تھا۔ تمام تر کہانیاں اچھی تھیں۔ اس کے علاوہ دوستی، عجیب امتحان بہت دل چسپ اور سبق آموز تھیں۔ بابا جی متاثر کن تھی جسے پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

(ای میل: سحرش جاوید، ملتان)





نیچرل ہسٹری، دی لسیبل یونیورسٹی میوزیم، دی برٹش میوزیم لندن اور دنیا کے دوسرے بڑے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں۔ زمین پر کروڑوں سال تک ڈائنوسار کا راج رہا ہے۔ ڈائنوسار کا ابتدائی سراغ تقریباً 13 کروڑ سال پہلے ملتا ہے۔ ڈائنوسار بنیادی طور پر چھپکلی جیسے تھے۔ وہ انڈے دیتے تھے مگر اپنے انڈے سیتے نہیں تھے۔ وہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال سے بھی آزاد تھے۔ چنانچہ ان کا ایک ہی کام تھا، خوراک ڈھونڈنا اور خوب سیر ہو کر کھانا۔ اس دور میں پورے کرہ ارض کی فضا گرم مرطوب تھی۔ حتیٰ کہ قطبی علاقوں میں برف کی بجائے جنگلات تھے اور وہاں بڑے پیمانے پر بارشیں ہوتی تھیں۔ دنیا بھر میں پانی اور نباتات کی بہتات تھی۔ خوراک کی فراوانی تھی جس کا اثر ڈائنوسار کے قد اور وزن کی شکل میں ظاہر ہوا۔

دنیا کے مختلف حصوں سے دریافت ہونے والی باقیات سے یہ نشان دہی ہوتی ہے کہ ڈائنوسار کی لمبائی 100 فٹ اور وزن 80 ٹن تھا۔ ڈائنوسار کی کئی اقسام تھیں، جن میں سے بعض نسلیں گوشت

تقریباً 200 ملین سال سے زائد عرصہ ہوا زمین کے ارضیاتی علاقے جسے سائنسی زبان میں Mesozoie کہتے ہیں، میں ہاتھی سے دگنی جسامت والے خوف ناک جانور رہتے تھے۔ سائنس دانوں نے انہیں ڈائنوسار کے نام سے موسوم کیا۔ یہ دو یونانی الفاظ کا مرکب ہے۔ Deino یعنی خوف ناک اور Saurus یعنی چھپکلی۔ ڈیڑھ دو کروڑ سال زندہ رہنے والی یہ نسل زمین پر حکومت کرتی رہی اور پھر اچانک بالکل ناپید ہو گئی۔ پانی و خشکی، ہر جگہ ان کی کوئی نہ کوئی قسم پائی جاتی تھی۔ طاقت اور وزن میں یہ اتنے بڑے تھے کہ کہا جاتا ہے کہ آج اگر ڈائنوسار ہوتے تو زمین پر کہیں بھی نباتات کا نام و نشان نہ ہوتا اور نباتات کے ختم ہونے کے بعد پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے انسانوں کی باری آتی۔

دنیا میں اس وقت ڈائنوسار کے بارے میں جتنی بھی معلومات ملی ہیں، وہ سب کی سب زمین میں دفن ان کی ہڈیوں اور انڈوں کو جمع کر کے حاصل کی گئی ہیں جو ہزاروں سال زمین میں دبے رہنے سے پتھر بن گئے تھے۔ ان کے مجرات (فاسل) امریکہ میوزیم آف



خور تھیں۔ غالباً 6 کروڑ سال پہلے ڈائنوسار دُنیا سے غائب ہو گئے۔ کوئی نہیں جانتا کہ آخر ایسے کیا عوامل تھے کہ ان کی نسل تک مٹ گئی۔ ڈائنوسار کے ختم ہونے کے بارے میں مختلف ماہرین کی مختلف آراء ہیں۔ بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ زمین پر شروع ہونے والا سرمائی دور، ان کے خاتمے کا سبب بنا۔ کچھ کا خیال ہے کہ کسی بڑے سیارچے کے زمین سے ٹکرانے سے ہونے والی تباہی ان کے خاتمے کا سبب بنی۔ بعض کی رائے ہے کہ وہ زمین پر موجود ساری خوراک چٹ کرنے کے بعد بھوک سے مر گئے۔ ماہرین کے ایک اور گروہ کا کہنا ہے کہ ڈائنوسار کی بڑی جسامت ہی ان کے خاتمے کا سبب بنی کیوں کہ ان کے دماغ تک یہ اطلاع نہیں پہنچ پاتی تھی کہ ان کی دم یا جسم کا کوئی حصہ کسی وجہ سے زخمی ہو گیا ہے۔ کچھ سائنس دانوں کے مطابق ڈائنوسار کی نسل کو خود ڈائنوسار نے ہی ختم کیا۔ وہ اس طرح کہ جب موسمی حالات تبدیل ہوئے تو درختوں کی پیدائش میں کمی ہو گئی۔ چنانچہ گھاس خور ڈائنوسار اپنی خوراک کی تلاش میں دُور دُور نکل گئے۔ ایسے میں گوشت خور نسل نے بے تاب ہو کر گھاس خور پر حملہ کر دیا۔ یوں طاقت ور نے کمزور کو اپنی خوراک بنا کر اپنی نسل کو ختم کر دیا۔ خیال یہ ہے کہ ڈائنوسار کے دُنیا سے مٹنے کے ایک سے زیادہ اسباب تھے۔

ڈائنوسار کے حوالے سے قدیم ترین ریکارڈ چین کی ایک کتاب سے ملا ہے۔ 317 عیسوی میں لکھی گئی اس کتاب کے مطابق ڈائنوسار کے سب سے زیادہ آثار موجودہ شمالی امریکہ، چین اور افریقہ کے علاقوں میں ملے ہیں۔

1824ء میں ایک سائنس دان نے ڈائنوسار کا مکمل ڈھانچہ بڑی محنت سے ایک ایک ہڈی کو جوڑ کر بنایا اور اس کا نام دیونما چھپکلی رکھا۔ اس کے بعد 1841ء اس کا نام دیونما گھاس خور رکھا گیا۔ پھر 1845ء میں اس کا نام خوف ناک چھپکلی پڑا۔ 1866ء میں اس بات کا ثبوت ملا کہ ڈائنوسار گھاس خور ہی نہیں گوشت خور بھی تھے۔ اس کے بعد ڈائنوسار پر مزید تحقیقات ہوئیں، جن کے نتیجے میں یہ معلوم ہوا کہ ان جانوروں کی 110

اقسام ہوتی تھیں۔ ان میں ایک قسم پروں والے ڈائنوسار بھی تھے۔ چند ایک کے علاوہ زیادہ تر ڈائنوسار گھاس خور اور سبزی خور تھے۔ یہ کرۂ ارض کے سب سے وزنی جانور تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بالغ ڈائنوسار کی جسامت تقریباً 6 ہاتھوں کی جسامت کے برابر اور خوراک 2 ٹن تک ہوتی تھی۔ یہ جانور زیادہ تر گرم علاقوں میں رہتے تھے۔ مادہ ڈائنوسار کسی ویران جگہ پر انڈے دیتی، پھر انہیں ریت میں دبا دیتی اور دوبارہ وہاں نہ آتی۔ ان انڈوں سے خود ہی بچے نکلتے جو بہت جلد بڑے ہو کر خود ہی اپنی خوراک حاصل کرنے میں کام یاب ہو جاتے۔

ڈائنوسارز اس روئے زمین پر سب سے بڑی جسامت والے جانور تھے مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ سب اپنے قد و قامت میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ ان میں ڈیلو ڈوکسی ڈائنوسارز زمین پر بسنے والے سب سے لمبے ڈائنوسارز تھے۔ ان کی گردن سے لے کر دم تک کی لمبائی 90 فٹ تک تھی۔ یعنی تین بڑی بسیں ایک قطار میں کھڑی ہوں جب کہ سب سے اونچے ڈائنوسارز بریکی سارس تھے۔ جو اگر آج ہوتے تو ان کا سر تین منزلہ عمارت کی چھت تک جا رہا ہوتا۔

حال ہی میں ہونے والی ایک نئی تحقیق میں کہا گیا ہے کہ ساڑھے 6 کروڑ سال پہلے جس خلائی چٹان کے زمین سے تصادم کے نتیجے میں قوی الجشہ جانور ڈائنوسار معدوم ہو گئے تھے، وہ ممکنہ طور پر ایک تیز رفتار دمدار ستارہ تھا۔ سائنس دانوں کے مطابق جس چیز کے ٹکرانے سے میکسیکو کے ایک علاقے چکسولوب میں 180 کلومیٹر طویل گڑھا بنا تھا، وہ شہاب ثاقب نہیں بلکہ دم دار ستارہ تھا۔ اس ٹکراؤ سے دُنیا بھر میں راکھ کی ایک تہہ بیٹھ گئی ہے جس میں اریڈیم نامی عنصر موجود تھا۔ یوں ساڑھے چھ کروڑ سال پہلے ہونے والے تصادم میں دُنیا سے تقریباً 70 فیصد انواع کا خاتمہ ہو گیا تھا اور ان میں نمایاں ڈائنوسارز تھے۔ وسیع پیمانے پر ہونے والی اس تباہی سے زلزلے آئے تھے۔ ساحلی علاقوں پر زبردست سونامی طوفان نے تباہی مچائی تھی اور وسیع پیمانے پر آگ لگ گئی تھی۔ ☆



نسرین شاہین



# جوڈو کی تاریخ

کہ اگر جوڈو کی یہ ہی صورت حال رہی تو جاپان میں اس آرٹ کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ پھر انہوں نے جاپان کے جوڈو کے بہترین اساتذہ سے یہ فن سیکھا اور اس میں سے اس کے مہلک اور خطرناک داؤ پیچ الگ کر کے ایک نئے اسٹائل کوڈو کان جوڈو (Kodokan Judo) کو متعارف کرایا۔ انہوں نے اس کھیل میں ایک اصول جو، جوڈو میں نہیں تھا ٹی سوری کومی (Tsuru Komi) متعارف کرایا۔ اس کے ذریعے پہلے اپنے حریف کے توازن کو بگاڑا جاتا ہے، پھر تھرو کر دیا جاتا ہے۔ دراصل ڈاکٹر جگورو کانو، جوڈو اور جوڈو میں

فرق واضح کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جوڈو میں ایک اعلیٰ اصول وضع کیا کہ ”کم محنت میں زیادہ کارکردگی“ جو مقبول ہوا۔

کوڈو کان جوڈو 1882ء میں قائم ہو چکا تھا لیکن اس کی ترقی کی رفتار بہت سست تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ لوگوں کے دلوں میں جوڈو بسا ہوا تھا اور اس کی دھند ابھی باقی تھی۔ 1886ء میں کوڈو کان اور جوڈو کے سب سے بڑے اسکول ٹوسوکا (To Tsuka) کے درمیان ایک مقابلہ ٹوکیو میٹرو پولیٹن پولیس بورڈ نے منعقد کرایا۔ اس مقابلے میں دونوں ٹیموں کے 15-15 کھلاڑیوں نے حصہ لیا۔ ان میں 13 میں کوڈو کان کو فتح ہوئی اور دو مقابلے برابر رہے۔ یہیں سے جوڈو کی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور جوڈو کی رہی سہی سا کھ ختم ہو گئی۔ جوڈو کو جاپان سے نکال کر دنیا بھر میں پھیلانے کے لیے ڈاکٹر جگورو کانو نے 1889ء میں اپنے ایک شاگرد یوکیو تانی کے ساتھ یورپ کا دورہ کیا۔ یوکیو تانی نے فن کا سب سے پہلا مظاہرہ برطانیہ میں کیا۔ یوکیو تانی نے برطانیہ کے گریٹ میوزک ہال میں اس فن کی تربیت دینی شروع کی اور اس وقت کے نامور پہلوانوں کو شکست سے دوچار کیا۔ یورپ کا پہلا جوڈو کلب 1919ء میں قائم ہوا۔ جب گنجی کوزومی نے ویسٹ منسٹر لندن میں معروف بودو کوائی کلب کا آغاز کیا۔ اس کلب

کسی بھی معاشرے کی فلاح اسی میں ہوتی ہے کہ لوگ صحت مندانہ سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہوں۔ کھیل صحت مندانہ سرگرمیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جوڈو دنیا کا مقبول ترین کھیل ہے۔ اس کھیل کی ابتداء جاپان سے ہوئی۔ جوڈو کے کھیل کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے، جتنی خود جاپان کی۔ جوڈو کے لفظی معنی ہیں، نرمی کا راستہ یا لڑنے کا شریفانہ انداز۔ جوڈو جاپان کا قومی کھیل ہے۔ جاپان میں جوڈو سے قبل ایک بہت ہی خطرناک کھیل جوڈو (Ju-Jitsu) کھیلا جاتا تھا۔ یہ ایک انتہائی مہلک اور خطرناک فن تھا۔ اس کا بانی ایک چینی راہب ”چھن یو آن پھنگ“ تھا۔ سترہویں صدی میں جٹو کے بہت سے اسکول قائم ہو چکے تھے، جن میں نوجوان سمورائی اس فن کی تربیت حاصل کرتے تھے۔ ان دنوں جاپان میں مغربی اقوام کی حکومت تھی۔ سمورائی اپنے ساتھ تلوار رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک جان لیوا فن تھا جس میں کسی ایک حریف کی جان چلی جاتی تھی یا پھر زندہ بچ جانے کی صورت میں وہ کم از کم عمر بھر کے لیے معذور ہو جاتا تھا۔ پھر 1871ء میں سمورائی جوڈو کے کھلاڑیوں پر تلوار رکھنے کی ممانعت ہو گئی، تاہم ان کے کھیل کے وحشیانہ پن میں کمی نہ آئی۔ تب ٹوکیو یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر جگورو کانو نے محسوس کیا



کا پہلا انسٹرکٹر یوکیوتانی تھا جو دوران تربیت شاگردوں پر سختی کے حوالے سے شہرت رکھتا تھا۔

ڈاکٹر جگوروکانو کے ایک اور بہترین شاگرد یاماشیتا نے امریکہ میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ یاماشیتا نے اس وقت کے امریکی صدر تھیوڈور روز ویلٹ کو بھی جوڈو کی تربیت دی۔ پیرس کی پولیس میں جوڈو بہ طور حفاظت خود اختیاری یعنی ”سیلف ڈیفنس“ کے طور پر سکھایا جانے لگا۔ جوڈو کا اولین بین الاقوامی مقابلہ 1926ء میں بودوکوائی کلب کے ارکان اور جرمنی کی قومی ٹیم کے مابین ہوا۔ جس میں بودوکوائی نے کامیابی حاصل کی۔ 1924ء میں یہ کھیل بھارت میں اور 1928ء میں آسٹریلیا پہنچا۔ اس کے 2 سال بعد افریقہ میں بھی اس کی شہرت ہو گئی۔ 1930ء تک جوڈو سیکھنے کی خواہش میں یورپ کے کافی ماہرین نے جاپان کا سفر کیا۔ اتنے سال گزرنے کے باوجود جوڈو ابھی تک حفاظت خود اختیاری ہی کی حیثیت سے سمجھا جاتا رہا۔ اس کو ایک باقاعدہ کھیل کا درجہ نہیں ملا تھا۔ تاہم 1948ء میں یورپین جوڈو یونین اور برٹش جوڈو ایسوسی ایشن قائم ہو چکی تھی جب کہ 1951ء میں انٹرنیشنل جوڈو فیڈریشن کا قیام عمل میں آ گیا۔

یورپین چیمپئن شپ اس فن کا پہلا سب سے بڑا ایونٹ تھا، جو 1951ء میں رائل البرٹ ہال میں منعقد ہوا۔ بعد میں یہ مقابلہ ہر سال کھیلا جانے لگا۔ پہلے تین مقابلوں میں برطانوی، ہالینڈ اور فرانسیسی کھلاڑیوں نے فتح حاصل کی۔ جاپانی کھلاڑیوں نے پہلی کامیابی عالمی جوڈو چیمپئن شپ جیت کر حاصل کی۔ یہ عالمی چیمپئن شپ 1956ء میں ٹوکیو میں ہوئی تھی۔ 1964ء کے ٹوکیو اولمپکس مقابلوں میں جوڈو کو شامل کیا گیا، گیزنک نے اوپن کلاس میں گولڈ میڈل جیتا۔ خواتین کے بین الاقوامی جوڈو مقابلوں کا آغاز 1980ء کی عالمی جوڈو چیمپئن شپ سے ہوا۔ 1988ء کے سیئول اولمپکس میں خواتین کے جوڈو مقابلوں کو نمائش کھیل کے طور پر شامل کیا گیا۔ 1992ء کے بارسلونا اولمپکس میں پہلی بار خواتین جوڈو کاز کے باقاعدہ مقابلے منعقد ہوئے۔

جوڈو کھیلنے کے مختلف طریقے ہیں مثلاً

☆ جوڈو فرش پر نہیں بلکہ ہارڈ فوم یا میٹریس پر کھیلا جاتا ہے،

جس کو ”تاتامی“ کہتے ہیں۔

☆ اس کھیل کے داؤ پیچ کے لیے مکمل طور پر جاپانی زبان کی اصطلاحات کا استعمال ہوتا ہے۔

☆ جوڈو ریسلنگ سے ملتا جلتا کھیل ہے، جس میں کک اور پنچ نہیں بلکہ تھروز کے ذریعے حریف کو شکست دی جاتی ہے۔

☆ کھڑے ہو کر کھیلنے کے انداز کو ”ناگے واز“ اور بیٹھ کر یا لیٹ کر کھیلنے کے انداز کو ”وزا“ کہتے ہیں۔

☆ جوڈو کا یونی فارم کراٹے جیسا لیکن کافی موٹا ہوتا ہے۔

☆ اس کی بنیادی ایکسرسائز بریک فال (اوکی می، Ukemi) یعنی گرنے کی طاقت کو توڑنا ہے۔

☆ اس کے مقابلوں کا دورانیہ کم از کم تین منٹ اور زیادہ سے زیادہ 5 یا 7 منٹ ہوتا ہے۔

☆ جوڈو میں ایک ریفری اور 2 کارز ججز ہوتے ہیں۔

☆ دنیا بھر کی قومی جوڈو فیڈریشنز، انٹرنیشنل جوڈو فیڈریشن کے قوانین پر عمل پیرا ہوتی ہیں۔ پانچوں خطوں کی بھی اپنی اپنی یونینز ہیں۔ ان میں یورپ کی FJU، ایشیا کی JUA، افریقہ کی AJU، لاطینی امریکہ کی PJU اور اوشیانیا کی OJU ہیں۔

بین الاقوامی مقابلوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس سلسلے میں پاکستان جوڈو فیڈریشن PJU کا کردار افسوس ناک رہا ہے، جس نے کبھی روایت سے ہٹ کر خود کوئی مخلصانہ جدوجہد نہیں کی۔ مجموعی طور پر PJU کبھی اتنی فعال نہیں رہی، جس سے جوڈو کو فروغ حاصل ہوتا۔ پاکستان جوڈو فیڈریشن اور پاکستان کراٹے فیڈریشن کا سابقہ نام پاکستان جوڈو اینڈ کراٹے بورڈ تھا۔ 80ء کی دہائی میں ملک بھر میں کراٹے کا کھیل بہت مقبول ہو چکا تھا، تاہم جوڈو کو وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی، جس کی اس کھیل کو ضرورت تھی۔ پھر پاکستان جوڈو فیڈریشن اور پاکستان کراٹے فیڈریشن کے نام سے دونوں کھیلوں کی الگ الگ فیڈریشنز وجود میں آئیں۔ تاہم جوڈو کے کھیل کو پاکستان میں زیادہ فروغ نہ مل سکا۔ واضح رہے کہ ملک کے 95 فیصد افراد وکھلاڑی جوڈو لفظ سے تو واقف ہیں مگر اس کھیل کے اسرار و رموز سے بالکل ناواقف ہیں۔ ان میں مارشل آرٹ کے کھلاڑی بھی شامل ہیں۔ لہذا فیڈریشن اس اولمپک آرٹ کو صحیح انداز میں سائنسی خطوط پر استوار کرے۔

☆☆☆



احمد عدنان طارق



## ہزاروں خواہشیں ایسی...

چھوڑ دی۔

وہ قد میں شوال کے گھٹنے تک بھی نہیں آتا تھا۔ سورج کی تمازت میں اس کی گہری سبز آنکھیں یوں چمک رہی تھیں جیسے کسی تالاب کے کنارے اُگی ہوئی کائی اور اس کی لمبی داڑھی تقریباً زمین کو چھو رہی تھی۔ مجھے آزاد کر دو، بونا گڑ گڑایا تو شوال نے کہا کہ تم میری ایک خواہش پوری کر دو گے تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ بونا حیرانی سے بولا۔ صرف ایک خواہش کیوں؟ عموماً لوگ تو تین خواہشوں کا کہتے ہیں لیکن شوال نے بونے کو بتایا کہ اسے صرف ایک ہی خواہش پوری کروانی ہے۔ بونے نے شوال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شوال کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ یہ ضد چھوڑ دے ورنہ اسے پچھتانا پڑے گا مگر شوال اپنی بات پر اڑا رہا بلکہ اس نے اپنے ہاتھ کی گرفت بونے کی کمر پر اور مضبوط کر دی۔ بونے نے ہار مانتے ہوئے شوال سے اس کی خواہش کے متعلق پوچھا۔

شوال نے بونے سے کہا کہ میری خواہش ہے کہ دن ہو یا رات، ہر گھنٹے کے بعد میری ایک خواہش پوری کی جائے۔ بونے نے شوال کی گرفت سے خود کو آزاد کروایا اور بے اختیار ہنسنے لگا۔ تم

شوال ایک بہت چالاک لڑکا تھا۔ اس کی بڑی پرانی خواہش تھی کہ کاش کبھی اس کی ملاقات کسی بونے یا بالشتیے سے ہو جائے کیوں کہ اس نے سن رکھا تھا کہ اگر کوئی شخص کسی بونے یا بالشتیے پر قابو پالے تو وہ آزاد ہونے کے لیے اس شخص کی ایک خواہش ضرور پوری کرتا ہے جس نے اسے قابو کیا ہو۔ شوال کو پورا یقین تھا کہ وہ بھی کسی بونے کو پکڑ کر اپنی ایک خواہش پوری کروا سکتا ہے اور اس ایک خواہش کے متعلق بھی اس نے خاصا سوچ رکھا تھا اور پھر آخر وہ گھڑی آ ہی گئی۔ ایک دوپہر جب وہ خاموشی سے جناح باغ میں مڑگشت کر رہا تھا۔

اس نے ایک گلاب کے پودے کے پیچھے ایک بونے کو نیم خوابیدہ حالت میں قیلولہ کرتے دیکھا۔ شوال جب بونے کے بالکل قریب پہنچ گیا تو بونے کو اس کی موجودگی کا علم ہوا۔ اس نے کوشش کی کہ وہ بھاگ جائے مگر اب شوال اسے کہاں جانے دیتا تھا۔ اس نے بازو بڑھا کر بونے کو ہاتھ میں دبوج لیا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ میں تڑپتے مچلتے بونے کو سختی سے سمجھایا کہ اب زور لگانے کا کوئی فائدہ نہیں، وہ بھاگ نہیں سکتا۔ تب بونے نے مزاحمت کرنا



سمجھتے ہو کہ تم بہت چالاک لڑکے ہو مگر یہ بات صحیح نہیں ہے۔ تم نے جو خواہش کی ہے ابھی سے پوری ہو گئی ہے مگر تمہیں اس کے لیے کچھتاوا ضرور ہوگا۔ یہ کہہ کر بونا پھولوں کی کنج میں غائب ہو گیا۔ باغ گھر سے خاصا دور تھا اور شوال چلتے چلتے خاصا تھک گیا تھا۔ راستے میں وہ اپنی چالاک پر خود ہی خوش ہوتا آ رہا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اس جیسی خواہش کسی نے نہ کی ہوگی مگر راستہ تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ آخر وہ ایک جگہ کھڑا ہو گیا اور اس نے دل میں خواہش کی کہ خوب صورت سی موٹر گاڑی ہو جو اسے اس کے گھر پہنچائے۔ چشم زدن میں ہوا سے ایک سرخ رنگ کی موٹر گاڑی ظاہر ہوئی اور شوال کے پاس رُک گئی۔ اس کا ڈرائیور ایک موٹا بد صورت سا بونا تھا جو شوال کو آداب بجا لایا۔ اس نے شوال کو بتایا کہ اس کا نام نجو ہے اور وہ شوال کی خواہشیں پوری کرے گا مگر شوال کی خواہش کے مطابق اب شوال کے لیے ضروری ہے کہ ہر گھنٹے کے بعد وہ کوئی نہ کوئی خواہش کرے۔ اس لیے کہ اگر شوال کسی گھنٹے خواہش کرنا بھول گیا تو نجو اسے ساتھ لے جائے گا اور وہ تمام زندگی غلام بن کر نجو کی خواہشیں پوری کرتا رہے گا۔

شوال نے اسے جھڑکتے ہوئے یاد دلایا کہ وہ یہ خواہش بھی کر سکتا ہے کہ نجو ہمیشہ کے لیے چلا جائے تو نجو نے شوال کی ہاں میں ہاں ملائی کہ وہ ایسا ضرور کر سکتا ہے مگر اس خواہش کے بعد اس کی مزید کوئی خواہش پوری نہیں ہو سکتی کیوں کہ اس کی خواہشوں کو بہر حال نجو نے ہی پورا کرنا ہے۔ شوال اس گفتگو کے بعد نجو کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو گیا۔ گھر پہنچنے پر اس کے سبھی گھر والے اس کی کہانی سن کر حیران و پریشان ہو گئے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کہانی پر یقین ہی نہ کریں مگر گاڑی اور نجو کو شوال کے ساتھ دیکھ کر انہیں یقین آ گیا۔ ماہم فوراً چلائی کہ اسے بہت سے ریشمی کپڑے چاہئیں، علی کی خواہش تھی کہ اسے بھی شوال جیسی گاڑی چاہیے، شوال کے والد اور والدہ نے بھی خواہشات کا انبار لگا دیا۔

بس پھر کیا تھا ہر گھنٹے کے بعد شوال نے کوئی نہ کوئی خواہش کی۔ اس نے رہنے کے لیے محل کی خواہش کی اور اس کے پورا ہوتے ہی سارا خاندان بھاگ بھاگ نجو کی موٹر میں اسے دیکھنے کے

لیے آ گیا اور رہنے کے لیے محل میں اپنے کمرے پسند کیے۔ شوال نے نوکر چاکروں کی خواہش کی تو ان کی ایک قطار سر جھکائے حاضر ہو گئی۔ پھر دولت مانگی تو اس کے ڈھیر لگ گئے جس سے شوال نے ملازموں کو ضروری سودا سلف خریدنے بازار بھیجا تا کہ شام کے وقت سارا خاندان اچھی سی ضیافت اڑا سکے۔ شام آٹھ بجے تک شوال ایک محل کا مالک بن چکا تھا جس میں دنیا کی ہر نعمت تھی۔ نوکر چاکر تھے، دولت کے انبار تھے، سونے کا تاج تھا جو شوال پہنتا تھا۔ اس کے سونے کے لیے چاندی سے بنا ہوا بیڈ تھا، اسے لگ رہا تھا جیسے اس کی ساری زندگی اسی ٹھاٹھ باٹھ سے گزری ہے۔

رات کے وقت اس نے نجو سے کہا کہ وہ تھک گیا ہے اور اب سونا چاہتا ہے، تم مجھے صبح آٹھ بجے جگا دینا۔ نجو نے اسے یاد دلایا کہ وہ کیسے سو سکتا ہے، اسے تو ہر ایک گھنٹے کے بعد خواہش کرنی ہے۔ شوال یہ سن کر گھبرا گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ ساری رات سو نہیں سکتا۔ یہ بھی نجو کی مہربانی تھی کہ اس نے ساری رات ہر گھنٹے کے بعد شوال کو جگایا اور اس سے اس کی اگلی خواہش کے بارے میں معلوم کیا۔ نیند کے عالم میں شوال ساری رات جانے کیا کیا خواہش کرتا رہا۔ صبح اس کے سر ہانے ایک سونے کا سائیکل، تین گانے والے پرندے اور ایک نیلی آنکھوں والی سفید بلی موجود تھی جو اسے دیکھ کر میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔ یہ چیزیں رات کو کی جانے والی خواہشوں کا نتیجہ تھا۔

اگلے دن بھی خواہشات کی برسات جاری رہی۔ شوال نے نجو سے ایک سلطنت کی خواہش کی۔ اپنی امی جان کے لیے ایک سونے کی انگوٹھی منگوائی جس پر بڑے بڑے ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ ابا کے لیے ایک سونے کا سگار منگوایا۔ ادھر شوال کے بھائی بہنوں میں خواہشات کی تکرار چھوٹی موٹی لڑائی سے بڑھ کر باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ منگوانا چاہتے تھے اور اس کے لیے انہیں اپنی باری کا انتظار کرنا منظور نہ تھا۔ آخر شوال نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ اس نے ان کی ہر خواہش اس لیے پوری کی تھی کہ وہ خوش رہیں لیکن وہ ہر وقت لڑنے میں مصروف ہیں، ویسے بھی راتیں جاگ جاگ کر شوال کا دماغ خراب



ہو گیا تھا۔ آخر اس نے نجو سے کہا کہ وہ ساری رات سونا چاہتا ہے تو نجو نے خوشی سے اسے دوبارہ یاد دلایا کہ اس طرح وہ اس کے قابو میں آجائے گا اور وہ اسے غلام بنا کر ہمیشہ کے لیے بہت دُور لے جائے گا۔

شوال نے جھنجھلاہٹ سے نجو کی طرف دیکھ کر اسے پوچھا کہ وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی خواہش سوچ کر تنگ آ گیا ہے اور وہ کون سا طریقہ ہے جس سے وہ نجو سے جان چھڑوا سکتا ہے۔ نجو نے اسے بتایا کہ ایک ہی طریقہ ہے جس سے اس کی جان چھوٹ سکتی ہے کہ وہ اسے کوئی ایسا کام بتائے جو نجو نہ کر سکتا ہو لیکن ظاہر ہے کہ دُنیا میں ایسا کوئی کام نہیں ہے جو نجو نہ کر سکتا ہو، اس لیے وہ موقع کی تلاش میں ہے کہ کب تم خواہش نہ کرو اور وہ تمہیں اپنا غلام بنائے۔ لہذا بے چارہ شوال ہر وقت خواہش سوچ سوچ کر ہلکان ہو گیا۔ پھر اس نے ایسی خواہشیں کیں جن کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ یہ پوری کرنا ناممکن ہے مثلاً اس نے نجو سے سات نیلے رنگ کے ہاتھی مانگے، جن کے کان پیلے رنگ کے ہوں مگر چند ہی ساعتوں میں وہ محل کے پچھواڑے میں کھڑے نیلی سونڈیں ہلا رہے تھے۔

ادھر شوال کی جان عذاب میں مبتلا تھی اور ادھر اس کے گھر والے آپس میں مسلسل لڑ رہے تھے کہ پہلے کس کی خواہش پوری ہو۔ ان کی لڑائی سے شوال بہت دل گرفتہ تھا۔ اس وقت بھی شوال کسی مزید خواہش کے متعلق سوچ رہا تھا کہ اچانک ماہم اور علی لڑتے ہوئے شوال سے جا ٹکرائے۔ شوال کے سر سے تاج اتر کر دُور جا گرا اور خود شوال کی بھی قلابازی لگ گئی۔ اس نے ماہم کو یاد دلایا کہ وہ بادشاہ ہے اس کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا جاسکتا تو علی اور ماہم ہنسنے لگے کہ وہ صرف شوال ہے، بادشاہ نہیں۔ غصے سے شوال کا رنگ سرخ ہو گیا، اس نے کہا ٹھیک ہے اگر میں شوال ہوں تو تم بھی علی اور ماہم ہو۔ تمہاری خواہشیں پوری کرتے کرتے میں تنگ آ گیا ہوں، اب میری خواہش ہے کہ سب کچھ ویسا ہی ہو جائے جیسے پہلے تھا۔ اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہی محل غائب ہو گیا اور ساتھ ہی ملازم بھی۔

ان کے قیمتی کپڑوں کی جگہ عام کپڑوں نے لے لی اور

دوسرے ہی لمحے وہ اپنے خستہ مکان میں تھے اور حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ شوال نے سب کو کہا کہ یہ بالکل ٹھیک ہوا آپ کے ساتھ بھی اور میرے ساتھ بھی کیوں کہ امیر ہونے سے پہلے ہم کبھی نہیں لڑتے تھے۔ ساری خرابی امیر ہونے کے بعد ہی شروع ہوئی۔ وہ اپنا سر ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ بے شمار دولت موجود ہونے کے باوجود انہوں نے کتنا بُرا وقت گزارا۔ ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد نجو صاحب البتہ ضرور آن دھمکے اور شوال سے پوچھنے لگے کہ کیا اسے اپنا محل واپس چاہیے مگر شوال نے نجو کو منع کرتے ہوئے چولہے سے کیتلی اتاری جس میں چائے کے لیے پانی ابل رہا تھا۔ اس نے نجو سے اپنی اگلی خواہش کا اظہار کیا کہ مجھے گرمی بھی لگ رہی ہے اور پیاس بھی، لہذا اس ابلتے ہوئے پانی سے فوراً برف جما دو۔

نجو نے پوری کوشش کی اور اپنا ہر حربہ آزما کر وہ ابلتے پانی سے فوراً برف نہ جما سکا۔ آپ کو پتا ہے کہ کوئی بھی ابلتے پانی سے ایک دم برف نہیں بنا سکتا۔ آخر تھک کر نجو نے کیتلی کو ایک طرف پھینک دیا اور ناراضگی سے کہنے لگا کہ یہ ناممکن ہے، میں یہ نہیں کر سکتا لہذا تم اپنی کوئی ایک خواہش پوری کرو لو تا کہ پھر میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاؤں۔ ”تو پھر میری آخری خواہش یہی ہے کہ تم غائب ہو ہی جاؤ۔ میں اب مزید کوئی خواہش کرنا نہیں چاہتا۔“ شوال نے نجو کو حکم دیا اور اسی وقت نجو ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا اور اس کے بعد کبھی نظر نہیں آیا اور نہ ہی کبھی شوال کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔

وہ اب اپنے خاندان کے ساتھ اپنے گھر میں رہ کر خوش تھا جہاں وہ سب محنت کر سکتے تھے اور کھیل کر اصلی ہنسی ہنس سکتے تھے بجائے ایک محل میں رہنے کے، جہاں ان سب کو لڑنے بھڑنے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ شوال نے دل میں سوچا کہ وہ خود کو کتنا ذہین سمجھتا تھا کہ ایک خواہش مانگنے سے اسے ہزاروں خواہشیں ملیں مگر درحقیقت وہ بے وقوف تھا اب اگر اسے چانس ملا بھی تو وہ کبھی لالچ نہیں کرے گا مگر اب اسے فکر کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ اب ایسا چانس اسے دوبارہ تھوڑا ہی ملنے والا تھا۔

☆☆



اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتب لیجئے۔  
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 مارچ 2014ء ہے۔

بلا عنوان



فروری 2014ء کے ”بلا عنوان کارٹون“ کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔



- ▶ نیٹ کی بیماری سب پہ بھاری، استعمال ہوا اچھا تو سب سے پیاری۔ (محمد کامران سعید، فیصل آباد)
- ▶ سوشل ویب سائٹ کی ڈرپ لگوائیں، اور گوگل سے آکسیجن پائیں۔ (عزیز سلیم وفا، سیال کوٹ)
- ▶ آج کے انسان کا نعرہ، انٹرنیٹ کے بغیر نہیں ہے گزارا۔ (زارا وہاب، اسلام آباد)
- ▶ ہائے! انٹرنیٹ سے علاج؟ انٹرنیٹ کا مرض تو ہے لا علاج۔ (ایمان حسن، لاہور)
- ▶ جدید دور کے نوجوان، نیٹ ہی دھڑکن نیٹ ہی جان۔ (محمد ہارون آصف، واہ کینٹ)





تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔

وادی کشمیر

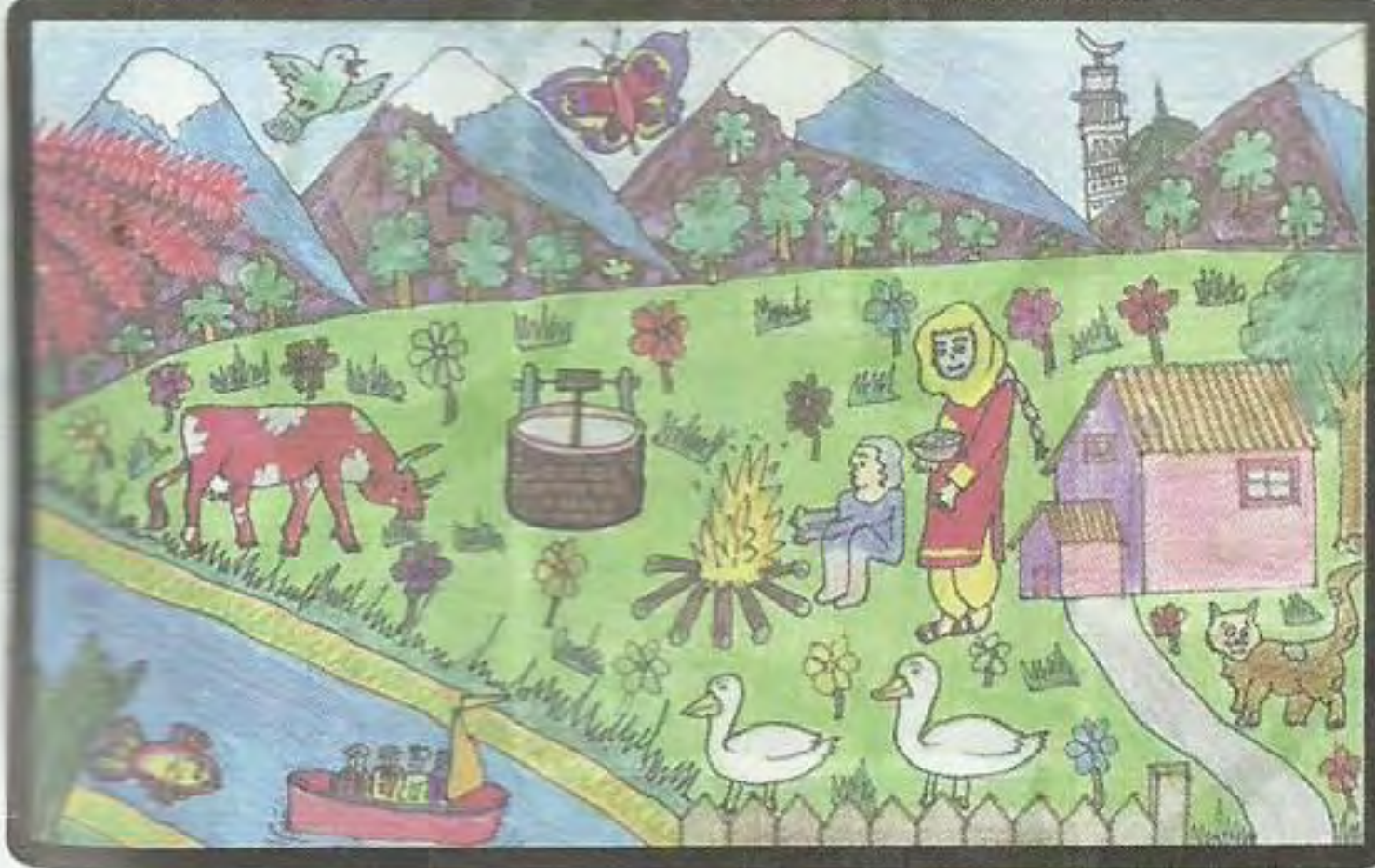
ہونہار مصور



محمد دانیال متین، لاہور (دوسرا انعام: 150 روپے کی کتب)



محمد الیاس بٹ، راول پنڈی (پہلا انعام: 175 روپے کی کتب)



شمرہ زاہد، راول پنڈی (چوتھا انعام: 100 روپے کی کتب)



عیشاء افضل، گوجرانوالہ (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)



انوشہ منظور، کراچی (چھٹا انعام: 75 روپے کی کتب)



آمنہ ظفر، لاہور (پانچواں انعام: 90 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قراءندازی: مومنہ شفقت، صفی اللہ محمد، واہ کینٹ۔ سید شہریار علی، لاہور۔ سعد حبیب، مانسہرہ۔ محمد احمد رضا انصاری، کوٹ ادو۔ عشاء سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ کاشف علی، عاشر، اوکاڑہ۔ رابعہ سلیم، فیصل آباد۔ زینت ذوالفقار، گوجرانوالہ۔ نائلہ جبین، عشاء خورشید، راول پنڈی۔ فرحین انور، احمد پور شرقیہ۔ امیر آفتاب، ایبٹ آباد۔ حاجرہ، حسن ابدال۔ مجیب الرحمن، وہاڑی۔ تحریم الاسلام، سرگودھا۔ محمد مجیر خان، بھکر۔ محمد وقار کیل انصاری۔ کامران عالمگیر، لاہور۔ انیس فاطمہ، وزیر آباد۔ ابراہیم داؤد ورک، راول پنڈی۔ محمد فرحان، واہ کینٹ۔ ایم ضار نوید، مندرہ۔ راحمہ رانا، گوجرانوالہ۔ امت الرحمن، میاں والی۔ عریشہ بتول، راول پنڈی۔ ایمن فاطمہ، مصفیہ، اوکاڑہ۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پینل یا ہیڈ مسٹر/س سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

اپریل کا موضوع  
موسم بہار

مارچ کا موضوع  
بادشاہی مسجد

آخری تاریخ 8 اپریل

آخری تاریخ 8 مارچ